مونوگراف
یاس یگانہ چنگیزی
حسن مثنیٰ

مونوگراف

یاس یگانہ چنگیزی

حسن مثنیٰ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9 انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

پہلی اشاعت	:	2017
تعداد	:	550
قیمت	:	-/90روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1950

Yass Yagana Changezee

By: Hasan Musanna

ISBN :978-93-5160-195-1

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی110025، فون نمبر:49539000، فیکس:49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر:26109746

فیکس:26108159 ای۔میل:ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، ڈی 31، ایس ایم اے انڈسٹریل ایریا، نزد جہانگیر پوری میٹرو اسٹیشن، دہلی۔110033

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

ہمارا دور بھی عجیب ہے ایک طرف جہاں اردو زبان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے تو دوسری جانب دوریاں نزدیکیوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ جدید تکنیکی انقلاب نے معلومات کے سمندر کو کوزے میں سمیٹ کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے ایسے میں اس خوف کا دامن گیر ہونا خلاف واقعہ نہیں کہ ہمارا قدیم وکلاسیکی ادب اس تکنیکی طلاطم کا شکار نہ ہو جائے۔

اپنے نابغہ ادیبوں وشاعروں پر مونوگراف لکھوانے کے اس نئے سلسلے کا آغاز اسی لیے کیا گیا ہے تا کہ ہم نئی نسل کے سامنے کم سے کم صفحات میں معروف ادبا کا سوانحی خاکہ بھی پیش کر سکیں اور ان کی تحریروں کے منتخب نمونے بھی۔

قومی کونسل نے اس سلسلے میں موجودہ اہم اردو قلمکاروں کی خدمات حاصل کی ہیں اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم قارئین کو براہ راست اپنے اس تجربے میں شامل کریں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اہم ادیبوں پر مونوگراف شائع کر دیں اور یہ بھی کوشش ہے کہ یہ مونوگراف معلومات کا ذخیرہ بھی ہو، اب اس معیار کو ہم کس حد تک حاصل کر سکے اس کا فیصلہ آپ کریں گے لیکن آپ سے یہ گذارش ضرور ہے کہ اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں ضرور نوازیں تا کہ ہم آئندہ ان مشوروں کو نشانِ منزل بنا سکیں۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈائرکٹر

فہرست

ابتدائیہ

مرزا واجد حسین (پیدائش 17/ اکتوبر 1884 وفات 4 فروری 1956) دنیائے علم وادب میں یاس یگانہ چنگیزی کے نام سے معروف ہیں۔ ابتداً وہ یاس عظیم آبادی تھے، لکھنؤ پہنچنے کے بعد یگانہ بنے اور پھر یاس یگانہ چنگیزی بن گئے۔ ان کی پیدائش مغل پورہ (پٹنہ سٹی) یعنی عظیم آباد میں ہوئی جو کہ صدیوں سے علم وادب اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ اس شہر کو یہ فخر وافتخار حاصل رہا ہے کہ یہاں کے نابغۂ روزگار علم وادب کا مرکز ومحور تو رہے ہی ہیں انھوں نے ہر دور میں محفل شعر وادب کو اپنے خون جگر سے چراغاں کیا ہے۔ بیدل سے شاد عظیم آبادی اور یاس یگانہ چنگیزی تک کی کہکشائیں اس کا بین ثبوت ہیں۔ لیکن ان سب میں یاس یگانہ چنگیزی اس لیے منفرد ہیں کہ ان کی ادبی کارگزاریاں ذرا مختلف ہیں۔ یگانہ چنگیزی پہلی مرتبہ 1905 میں علاج و معالجہ کے سلسلے میں لکھنؤ گئے تھے، بعد کو انھیں یہ گہوارۂ علم وادب کچھ اس قدر پسند آیا کہ وہ اس کے دام میں آئے بغیر نہ رہ سکے بلکہ یہ کہا جائے کہ وہ بہت جلد اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ انھیں یہیں رہنا بسنا ہے، جس کا نتیجہ تھا کہ 1911 میں وہ اسے اپنا وطن ثانی بنا چکے تھے۔ اس فیصلے کو اس وقت مزید تقویت ملی جب ان کی شادی 1913 میں لکھنؤ کے ہی ایک خانوادے میں ہوگئی۔

اکیس بائیس برس کے اس نوجوان میں کتنی توانائی تھی، کتنا بل تھا اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ میں فروکش ہونے کے بعد اس نے چند برسوں میں ہی اپنا لوہا

منوالیا جو کہ کوئی کھیل نہ تھا۔ اس کے لیے انھیں کبھی پرانی روایت کے مداح شعرا سے نبرد آزمائی کرنی پڑی تو کبھی اپنے ہم عصر شعرا کی تنقید لکھ کر انھیں آئینہ دکھانا پڑا۔ بہر حال جس شخص کے نام میں ہی اس قدر الٹ پھیر ہوں، جو خود کو نہ جانے کن کن القاب و آداب سے نوازتا ہو، اور خود کو اس کا مستحق بھی سمجھتا ہو۔ اس کی شخصیت، اس کی ادبی زندگی کس کس طور پروان چڑھی ہوگی اس کا اندازہ اس مونوگراف سے ضرور لگایا جا سکتا۔

ان کی شاعری کی ابتدا یاس تخلص سے ہوئی تھی، لیکن بعد کو وہ یگانہ لکھنوی اور پھر یاس یگانہ چنگیزی بن گئے، ان کی ادبی شناخت ان کی انا، کج کلاہی اور خود پرستی و خود آگہی سے عبارت ہے۔ شاید اسی بنا پر ان کے ہم عصروں سے ان کی نہ بن سکی اور ان کے خلاف مخالفت کی لے شدید تر ہوتی چلی گئی۔ اس کا خمیازہ انھیں کبھی معاشی بحران کا سامنا کر کے بھگتنا پڑا تو کبھی غریب الوطنی کے عالم میں در بدر کی ٹھوکریں کھا کر لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ تاحیات ادبی منافقت سے کوسوں دور تھے۔ ''یگانہ تنقید'' اور ''یگانہ فہمی'' میں میری دلچسپی کی وجہ بھی یہی رہی کہ ایک ایسا شخص جس نے تمام عمر ایک قسم کی ذہنی کجی اور تضاد سے ناطہ رکھتے ہوئے زندگی گزاری، اس کا تجزیہ کیا جائے، ان مثبت و منفی پہلوؤں پر نگاہ ڈالی جائے اور وہ گتھی سلجھائی جائے جس کے تار و پود ابھی تک بکھرے ہوئے ہیں۔ مرزا یگانہ کو بھی اس بات کا احساس ضرور رہا ہوگا کہ ان کے اندر موجود تضاد اور الجھنوں کے حوالوں سے ہی سہی وہ ہمیشہ موضوع بحث رہیں گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایک دفعہ انھوں نے یہ شکوہ بھی کیا تھا کہ ان کا ملک ان کے ذہن کی انقلابی رفتار سے فائدہ اٹھانے کے بجائے انھیں نظر انداز کر رہا ہے۔ سچ بھی یہی ہے کہ ان کی شاعری اور نقطۂ نظر پر کم از کم ان کے دور کے ناقدین نے توجہ مرکوز نہیں کی، لیکن اب یہ سلسلہ دم توڑ چکا ہے۔ جسے ہم مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی ادبی عظمت اور ان کی کامیابی قرار دے سکتے ہیں۔

میری نظر میں وہ اس لیے بڑے شاعر نہیں ہیں کہ انھوں نے نیرنگ زمانے سے نبرد آزمائی کی یا وہ منبع علم و ادب تھے یا پھر انھوں نے بڑے بڑے بتوں کو توڑنے کی کوشش کی بلکہ ان کی بڑائی اس بات میں مضمر ہے کہ ان میں اظہار ذات کا وافر عنصر پایا جاتا ہے۔ کھلے بندوں اپنی بات بہ بانگ دہل کہہ دینا کس درجہ اہم اور حوصلہ کی بات ہے، اس سے کون واقف نہیں۔ میرے

خیال میں ان کے ساتھ جو ادبی ناانصافیاں ہوئیں، یا پھر انھیں جن انتہا پسندیوں کا سامنا کرنا پڑا، اس میں ان عوامل کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ زمانے نے ان کے تئیں جو سلوک روا رکھا یا انھیں ان کا جائز مقام نہ ملنا ان سب میں ان کا رویہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے ممتاز شاعر تھے اس کا اعتراف ان کے زمانے میں بھی ہوتا رہا اور آج بھی اس میں کوئی شک نہیں۔ آج بھی ان کی قدر و منزلت ویسی ہی ہے بلکہ اب وہ شاید کچھ زیادہ اہم ہو گئے ہیں کہ ان کی بازیافت از سر نو کی جا رہی ہے۔ یہ سب ان کی انفرادیت کے طفیل ہو رہا ہے جس کے در پردہ ان کا طرز فکر، ان کے لہجہ کا بانکپن، ان کی انانیت اور ان کی خود پرستی کا اہم رول ہے۔

مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی شخصیت عجیب و غریب رہی ہے اس میں شک نہیں، ایسا اس لیے کہ انھوں نے جس سرزمین سے لو لگائی وہی ان کے لیے کرب و بلا بن گئی اور جن ناقدین ادب سے انھیں امیدیں تھیں وہی ان سے صریحاً تغافل برتتے رہے بلکہ کئی ایک نے تو انھیں نشانے پر لے لیا۔ بہر حال عہد رفتہ کے نقادوں کے خیالات سے قطع نظر نئی تنقید اور نئی نسل ''یگانہ فہمی'' کے سلسلہ میں نہ صرف قدم آگے بڑھا رہی ہے بلکہ انھیں بہ سرو چشم قبول کر رہی ہے۔

یوں بھی مرزا یاس یگانہ چنگیزی پر مختلف اوقات میں مختلف نوعیتوں کے کام ہوتے رہے ہیں جن میں مجنوں گورکھپوری، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، ممتاز حسین، مجتبیٰ حسین، راہی معصوم رضا، باقر مہدی، کے کے کھلر، ضیا عظیم آبادی، ساحل احمد اور پروفیسر نیر مسعود وغیرہ کے کاموں کی خوب پذیرائی ہوئی لیکن اکادمی بازیافت، کراچی اور مشفق خواجہ (پاکستان) شاید ان معنوں میں سب پر سبقت لے گئے کہ انھوں نے یگانہ سے متعلق چھوٹی سے چھوٹی معلومات بہم پہنچانے کی کوشش تو کی ہی ایک جامع ''کلیات یگانہ'' بھی دنیائے شعر و ادب کے حوالے کیا۔ میں نے اس مونوگراف کی تکمیل میں ان سبھی ناقدین یگانہ کی نگارشات سے استفادہ کیا ہے۔ جس کے لیے میں ان سبھی زعمائے ادب کا حد درجہ ممنون و مشکور ہوں۔

زیر نظر مونوگراف میں یگانہ کی شخصیت و سوانح، ان کے تخلیقی سفر اور ان کی شاعری پر مبنی ایک تنقیدی محاکمہ ''یگانہ فہمی: ایک تنقیدی محاکمہ'' کے عنوان سے شامل ہے، نیز غزلوں اور رباعیات پر مشتمل ایک جامع انتخاب بھی تاکہ قارئین کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا جا سکے۔ ہاں

یہاں یہ بات ملحوظ نظر رہے کہ اس انتخاب میں میری پسند کی غزلیں اور ان کے چنندہ اشعار ہی درج ہیں نہ کہ مکمل کلام یگانہ، کچھ یہی حال رباعیوں کا بھی ہے کہ مجھے جو رباعیاں زیادہ اپیل کر گئیں انھیں شامل کر لیا گیا، نیز یہ بھی کہ اس میں بھی تقدیم و تاخیر یا پھر ترتیب کلام کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے کہ کون سا کلام کب لکھا گیا کہ اسے اسی ترتیب سے رکھا جائے۔ میرا مقصد صرف یہ رہا کہ ان کا منتخب کلام قارئین تک پہنچ جائے اور بس۔ لیکن ایسے میں بھی جب کہ میں اس کام کو کرنے میں مصروف تھا، مجھ میں یہ احساس جاگزیں ہوتا چلا گیا کہ جوں جوں ان پر تحقیقی کام ہوتا جائے گا ''یگانہ فہمی'' کی نئی نئی راہیں کھلتی جائیں گی اور تاریخ شعر وادب میں ان کو ان کا جائز مقام مل کر رہے گا۔

مجھے ڈاکٹر سید شاہد رضا (پاکستان)، ڈاکٹر محسن رضا رضوی، ڈاکٹر سراج اجملی، ڈاکٹر عراق رضا زیدی، ڈاکٹر احمد سجاد، ڈاکٹر سبحانی، جناب یعقوب راہی کے علاوہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) اور سینٹرل لائبریری جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے اہل کاروں کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے مواد کی فراہمی میں تعاون بخشا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ذمہ دار اراکین وعہدے داران کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا خوشگوار فریضہ ہے، خصوصاً ادارے کے روح رواں ڈائرکٹر پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم) کا جن کی عنایتوں کے عوض یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ سکا، کہ اسے میں اپنی عزت افزائی سمجھتا ہوں۔ مجھے پروفیسر عتیق اللہ کی شفقتوں اور ان کے بے پناہ خلوص پر ناز ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہی ہماری ادبی مشغولیات میں معاون رہے ہیں۔

میری شریک حیات زہرا رضوی نے اس کام کی تکمیل میں میرا ساتھ اس وقت دیا جب امی کی وفات کے سبب تمام اہل خانہ رنج وغم کے سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے نہ صرف گھریلو مصروفیات سے دور رکھا بلکہ گاہے گاہے حوصلہ بھی بڑھاتی رہیں۔ ہاں ایسے میں اپنے جگر گوشوں مدبر نعیم، کاوش کریم اور نوازش کبریا کے حصے کا بہت سارا وقت ضائع ہو گیا، اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ دعا گو ہوں کہ خداوند کریم انھیں علم وادب کی نعمتوں سے فیض یاب کرے، انھیں ایک اچھا انسان بنائے۔

اس مونو گراف کو سپرد قلم کرتے وقت اس بات کو ملحوظ نظر رکھا گیا ہے کہ مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر نہایت باریک بینی سے روشنی ڈالی جائے تا کہ اسی حوالے

سے ان کی ادبی حیثیت کا تعین کیا جا سکے۔ نیز یہ بھی کہ ان سے متعلق کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جا سکیں۔ میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب رہا اس کا حتمی فیصلہ قارئین اور شائقین علم وادب کی بارگاہ میں پیشی سے ہی ممکن ہے۔ لیکن میرا ایقان ہے کہ اس ادنیٰ سی کوشش سے ایک بار پھر ''یگانہ فہمی'' کی بازیافت کا عمل ضرور مہمیز کیا جا سکے گا۔ اگر ایسا ممکن ہو سکا تو میں خود کو کامیاب تصور کروں گا۔

حسن مثنیٰ

شخصیت وسوانح

مرزاواجد حسین جن کا تاریخی نام مرزافضل علی بیگ تھادنیائے علم وادب میں مرزایاس یگانہ چنگیزی کے نام سے معروف ہوئے اورایسی شہرت پائی کہ ان کی شناخت دودبستانوں دبستان عظیم آباد اور دبستان لکھنؤ دونوں ہی کا اہم ترین حوالہ بن گئی۔ بقول یاس یگانہ ؎

جان سے بڑھ کر سمجھتے ہیں مجھے یاس اہل دل
آبروئے لکھنؤ، خاکِ عظیم آباد ہوں

ان کی شاعری کی ابتدایاس تخلص سے ہوئی اس وقت وہ عظیم آبادی ہی تھے لیکن بعد کو یگانہ لکھنوی بن گئے پھریاس یگانہ چنگیزی ان کی ادبی شناخت بن گیا۔ ان کی پیدائش مغل پورہ، پٹنہ سٹی میں ہوئی جوکہ صدیوں سے علم وادب اورتہذیب وتمدن کا گہوارہ تصور کیا جاتا رہا ہے۔ اس شہر کو جسے پاٹلی پتر بھی کہا جاتا ہے، ایک زمانے تک مگدھ کی راجدھانی تھی۔ اسے یہ فخر وافتخار بھی حاصل ہے کہ یہ شہر صرف سمراٹ اشوک کا دارالخلافہ ہی نہیں رہا بلکہ یہاں امن و اہنسا کے اوتاراور پرچارک گوتم بدھ نے بھی اپنی جوت جگائی اوراسی ریاست سے اپنے فکر کی شمع روشن کرتے ہوئے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ پورا خطہ بودھ مذہب کی اولین آماجگاہ بنا، اس خطہ کی ایک اہم شناخت ایک اسلامی مرکز کے طور پر بھی ہوتی رہی ہے۔ شاید یہی وجوہات تھیں کہ یہاں ہر زمانے میں نہ صرف مختلف طبقۂ فکر کے معززین رہتے بستے رہے بلکہ یہ شہر باکمالان فن کا

مسکن رہا ہے۔ ان سبھی حضرات نے اپنی گوناگوں خوبیوں کی بنا پر اس شہر کو وہ عظمت بخشی ہے کہ یہ شہر ادبی منظر نامہ پر ایک دبستان کی صورت ظہور پذیر ہوا۔ مرزا عبدالقادر بیدل، خواجہ امین الدین امین، شیخ محمد روشن جوشش، شیخ غلام علی راسخ، میر وزیر علی عبرتی، مرزا امان علی ذبیح، جناب خان بہادر سیّد علی محمد صاحب شاد، جناب شمس العلما نواب سیّد امداد امام اثر اور خود میرزا[1] یاس یگانہ چنگیزی سے کون سا ادب شناس واقف نہیں۔ یہ وہ جواہران معدن علم وفن ہیں جن پر ایک زمانہ ناز کرتا ہے۔

مرزا یگانہ چنگیزی نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے کہ ان کے جد امجد مرزا حسن بیگ چغتائی اور مرزا مراد بیگ چغتائی صاحب سیف تھے جن کا شجرۂ نسب حضرت چنگیز خاں سے جاملتا ہے اسی بنا پر وہ خود کو چنگیزی لکھنے میں فخر محسوس کرتے تھے جبکہ وہ خود صاحب قلم تھے۔ بہر حال ان دو بھائیوں نے عہد مغلیہ میں ایران سے ہندستان کی طرف رخ کیا اور شاہان مغلیہ سے وابستہ ہو گئے۔ انھیں ان کی خدمت کے صلے میں چند جاگیریں، پرگنہ حویلی عظیم آباد کی عطا ہوئی تھیں۔ جو کئی نسلوں تک ان کی میراث رہی۔ مختصراً یہ کہ ننھیال اور ددھیال دونوں سلسلوں سے ان کا شمار صاحب ثروت لوگوں میں ہوتا تھا لیکن اولین جدو جہد آزادیٔ ہند جسے 1857 کی سپاہی بغاوت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، کے بعد کون کہاں گیا کسی کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

بقول شخصے یگانہ بھلے ہی اوسط قد کے تھے، رنگ سانولا سلونا تھا لیکن نین نقش تیکھے تھے۔ ان کے چہرے پر نہایت ہی ذہین اور چمک دار سیاہ آنکھیں سجی ہوئی تھیں جو سب کچھ بیان کر دینے پر قادر تھیں۔ ہاں ان آنکھوں پر چشمہ لگائے رکھنا ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ یگانہ کا چہرہ تو صاف وشفاف تھا لیکن ان پر گھنی گھنی مونچھیں اپنا کرشمہ دکھاتی رہتیں۔ سر پر ہمہ وقت ٹوپی لگائے رہتے اور جب بھی شیروانی زیب تن کرتے اس کی جیب سے گھڑی کی زنجیر نظر آتی رہتی۔ سفید لٹھے کا پائجامہ، پیروں میں سیاہ رنگ کا پمپ شو اور ہاتھ میں ہلکی سی بید کی چھڑی ہوا کرتی جو شان یگانہ میں اضافہ کا باعث ہوتی۔ دیکھیں یہ اقتباس جس میں یگانہ کی شکل وصورت پر روشنی پڑتی ہے۔

1۔ اس مونوگراف میں جگہ جگہ میرزا اور مرزا دونوں ہی طریقہ سے یاس یگانہ چنگیزی کا نام لکھا گیا ہے۔ واضح رہے کہ انھوں نے بھی اپنے مجموعوں میں ان دونوں طریقوں کو اختیار کیا ہے۔

''یگانہ کا قد درمیانہ اور بدن چھریرا تھا۔ ایرانی ٹوپی پہنتے تھے۔ جو ماتھے پر ایک بانکپن کے ساتھ ذرا ترچھی جمی ہوتی۔ پیشانی کشادہ تو نہیں تھی مگر تنگ بھی نہیں تھی۔ آنکھیں بڑی اور روشن، ناک کھڑی تھی۔ یگانہ کی آنکھوں سے کبھی کبھی ایک طرح کی شوخی بھی جھلک اٹھتی۔ یہ آنکھیں عجب انداز سے مسکراتیں...... مسکراہٹ ان کے گوشوں میں پھول کی طرح کھل اٹھتی...... آنکھوں کے ساتھ ہونٹ بھی مسکراتے۔ دونوں ایک دوسرے کا جواب تھے۔ دونوں میں ایک ہی سا تبسم کھل اٹھتا۔ اسی لیے یگانہ کے چہرے پر کسی قسم کی منافقت نہیں پائی جاتی تھی۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ہونٹ ہنس رہے ہوں اور آنکھیں خاموش ہوں یا آنکھیں مسکرا رہی ہوں اور ہونٹ بھنچے ہوئے ہوں۔ لباس میں سادگی تھی۔ شیروانی، بڑی مہری کا پاجامہ اور پاؤں میں پمپ۔ ٹانگوں میں کمانوں کی طرح ذرا سا خم۔ چلتے تو جھومتے چلتے۔ مگر ان کی رفتار میں کوئی کجی نہیں تھی۔ سیدھی سادی شریف آدمی کی چال تھی۔

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا

چال سے تو کافر پر سادگی برستی ہے''[1]

میرزا یگانہ کو کھانے پینے کا بہت شوق تھا، خصوصاً پائے اور بھنی ہوئی پالک کی سبزی وہ بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ انھوں نے کبھی شراب کو ہاتھ تک نہ لگایا اور نہ ہی سر بازار کوئی چیز لے کر کھائی ان دونوں ہی کو وہ حد درجہ برا تصور کرتے تھے۔ دیکھیں ان کی بیٹی بلند اقبال بیگم کے مضمون ''بھائی ابا'' کے حوالے سے یہ اقتباس جس سے ان کے متعلق کئی چیزوں کی تصدیق ہوتی ہے۔

''پھلوں میں ان کو انگور، سیب، قندھاری انار اور سب سے زیادہ آم بہت پسند تھا خاص کر لنگڑا آم کھاتے وقت عظیم آباد کا لنگڑا، ان کو ضرور

---

1. مجتبیٰ حسین: مقدمہ، یگانہ (مرتبہ: ساحل احمد) صفحہ 15-14

یاد آ جایا کرتا تھا۔لکھنؤ کا دسہری اور سفیدا پسند تھا۔نول کشور پریس کی ملازمت چھوٹنے سے پہلے ان کا معمول تھا کہ ہر چوتھے روز منڈی جا کر وہاں سے دسہری اور لنگڑے کی نیم پختہ ڈھیری مزدور کر کے لاتے ...... رات کو فکر سخن میں اکثر جاگتے رہتے تھے......تفکر سخن وہ اکثر اطمینان کے وقت کرتے......ان کی عزیز اور نایاب قیمتی چیزیں مسافرت کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے تلف ہو گئیں جن کا ان کو دکھ محسوس ہوتا۔خیال آنے پر خاص طور سے اپنی کتابوں کے ضائع ہونے پر تاسف کرتے۔بیدل اور صائب کا دیوان تو ہمہ وقت سفر وحضر میں ساتھ ہی رہتا......شعر کی آمد جب ہوتی تھی تو گنگناتے رہتے تھے،مکمل ہو جاتا تو ترنم سے دھیمی آواز میں پڑھتے رہتے۔"1

ان کے آباؤ اجداد شیعہ اثنا عشری تھے،اسی بنا پر وہ بھی اسی عقیدے پر قائم تھے۔لیکن ان کا مزاج کچھ ایسا تھا کہ وہ کئی بار ان رسومات سے بیزار نظر آتے جو فرقہ اثنا عشری میں عقیدتاً رائج تھیں لیکن ان کے دل میں محبت اہل بیت جاگزیں تھی اس کے وافر ثبوت ان کے کلام سے بہم پہنچتے ہیں۔دیکھیں ان کی صاحبزادی بلند اقبال بیگم کے مضمون "بھائی ابا" سے یہ اقتباس جس سے ان کے مذہبی رجحان پر روشنی پڑتی ہے۔

"......عبادت کے ایک حد تک موافق تھے۔میں نے بچپن میں روزے رکھتے بھی دیکھا اور نماز پڑھتے بھی مگر پابندی سے نہیں۔جب دل چاہتا تھا تو رمضان میں چار یا پانچ روزے رکھ لیتے تھے اور نماز بھی پڑھتے تھے۔خاص کر صبح کی نماز کو وہ یوں بھی اکثر پڑھنے کے بعد قرآن شریف کی تلاوت لحن سے کرتے جو کانوں کو بھلی لگتی۔جب کسی قسم کی خوشی یا کامیابی ہوتی تو بطور شکر نماز ضرور پڑھتے تھے۔لکھنؤ کے مشہور و معروف خطیب مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ کی مجالس عشرۂ محرم میں بہت شوق سے نانا ابا کے ساتھ روزانہ صبح کو جاتے......روز عاشورہ سر و پا برہنہ جلوس علم میں شرکت کے بعد فاقہ سے رہتے اور مرثیہ انیس پڑھ کر مغموم و محزون دن گزارتے۔شام پانچ بجے سب کے ساتھ فاقہ شکنی کرتے 2۔"

1۔ بلند اقبال بیگم۔"بھائی ابا"،بحوالہ۔یگانہ(مرتبہ:ساحل احمد)صفحہ 331-330

2۔ بلند اقبال بیگم۔"بھائی ابا"،بحوالہ۔یگانہ(مرتبہ:ساحل احمد)صفحہ 342

ملاحظہ فرمائیں ان کا شجرہ جس سے ان کے سلسلۂ نسب کی تصدیق ہو سکے گی۔
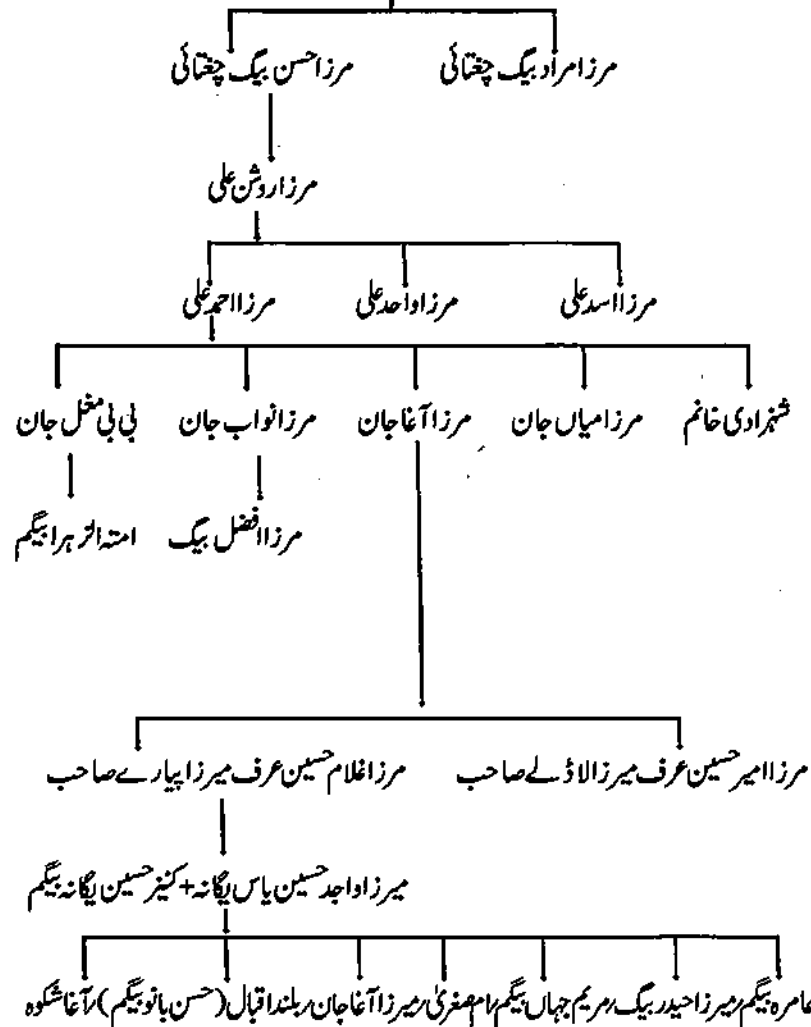
مرزا یاس یگانہ چنگیزی خود فرماتے ہیں کہ بی بی مغل جان جو میرے پردادا حاجی مرزا احمد علی صاحب کی بڑی صاحبزادی تھیں۔ وہ صاحب ذوق تو تھیں ہی ان کی سبھی قدر کیا کرتے تھے۔ میں نے ان کی زبانی سنا ہے کہ ہمارے بزرگ دہلی سے میدنی پور آئے پھر وہاں سے کوچ کر

کے عظیم آباد میں جا بسے۔ اسی عظیم آباد میں جس کی شناخت منبع علم وادب کے طور پر ہوا کرتی تھی، جہاں دنیا جہان کے نابغۂ روزگار رہتے بستے تھے۔ مرزا یگانہ کی زبانی اس امر کی نشاندہی کی کوئی روایت نہیں ہے بلکہ اس کے تاریخی شواہد بھی موجود ہیں۔

بہر حال اسی بنا پر قیاس لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مقام سے دوسرے مقام کی نقل مکانی کا یہ واقعہ غالباً شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں ہی پیش آیا ہوگا۔ کیونکہ اس وقت میدنی پور صوبہ اڑیسہ کا حصہ تھا جسے شہنشاہ کے اک سپہ سالار خان دوران خان نے فتح کیا تھا۔ غالباً یہ وہی خان دوران خان تھے جن کی ماتحتی میں میرے مورث اعلیٰ مرزا حسن بیگ چغتائی نے کوئی نمایاں خدمت انجام دی ہوگی جس کے صلے میں انھیں یہ جاگیر ملی جو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہی کہ اس کا کچھ حصہ میرے والد کو بھی ملا تھا۔ چنانچہ منجملہ اور مواضعات کے اک موضع فہیم پور بھی تھا بقول بی بی مغل جان یہ شاہی عطیہ تھا۔

اس موضع میں میرے والد کا بھی حصہ تھا جسے وہ میرے لڑکپن ہی میں فروخت کر چکے تھے۔ بی بی مغل جان اور شہزادی خانم صاحبہ دونوں بہنوں نے اپنا اپنا حصہ تبرک کی طرح سنبھال کر رکھا تھا مگر آخر میں بھائی، بھتیجوں کی ناعاقبت اندیشی اور چھمن سنگھ ٹھیکہ دار کی دغابازی سے مقروض و مجبور ہو کر دونوں بہنوں کو اپنا اپنا حصہ بحق ٹھیکہ دار مذکورہ بیع کر دینا پڑا۔ بقول مرزا یگانہ جب سب رجسٹرار صاحب بیع نامہ کی رجسٹری کرنے کے لیے میرے گھر پر آئے تھے، مجھے خوب یاد ہے کہ اس شاہی عطیہ کے تلف ہونے پر ان دونوں بہنوں نے گھر میں کہرام برپا کر دیا تھا۔ گرچہ خاص مرزا احمد علی صاحب کے حاصل کیے ہوئے بعض مواضعات مثلاً محمد پور، رسول پور، دھول پورہ، مرچی وغیرہ میں تھوڑے حصے ابھی بھی باقی تھے مگر اس شاہی عطیہ کے تلف ہو جانے کا شدید ترین غم ان لوگوں کو بے حال کیے جا رہا تھا۔

یہ تو حال تھا اس خانوادے کی بے بسی کا، مرزا یگانہ کا بیان ہے کہ ان کے ننھیالی بزرگ لکھنؤ سے عظیم آباد میں جا بسے تھے لیکن ان لوگوں کے تعلقات مرشد آباد سے بھی تھے۔ پیش ہے ان کا ننھیالی شجرہ جس سے یہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ 1857 اور 1947 کے بعد پورا ملک ایک عجیب سی افراتفری کا شکار رہا اور اس میں کون کہاں گیا کچھ پتہ نہیں چلتا لیکن تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ شاید اب بھی ان خانوادوں کے کچھ لوگ ان مقامات پر آباد ہوں۔
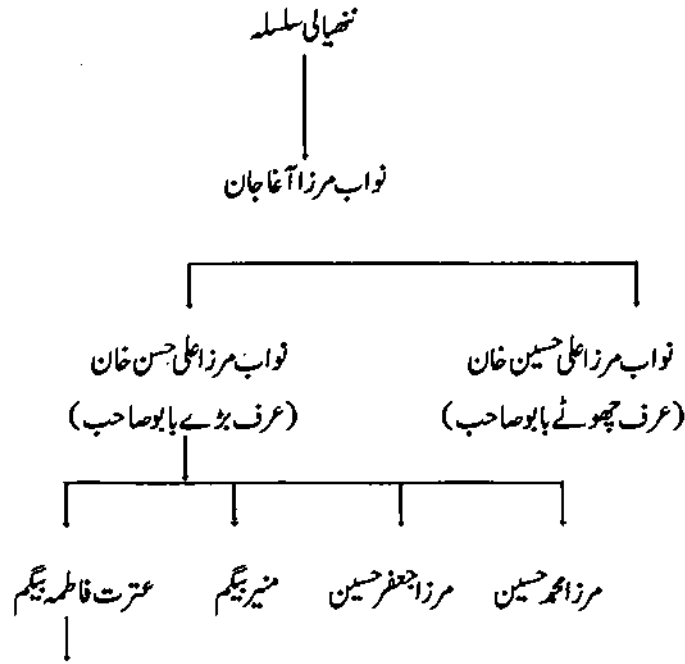
بقول مرزا یگانہ چنگیزی ان کی تاریخ ولادت تخمیناً 27/ذی الحجہ 1301ھ بمطابق 17/اکتوبر 1884 قرار پاتی ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید صاحب حسرت عظیم آبادی کے مدرسے میں حاصل کی۔ اس کے بعد عظیم آباد کے محمڈن اینگلو عربک اسکول، پٹنہ سٹی میں داخل ہوئے اور اپنی ذہانت کی بدولت وہ اوّل سے آخر تک امتیازی درجہ پر فائز رہے کہ تمغے اور انعام ان کے حصہ میں آتے رہے۔ اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد انھوں نے 1903 میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ انھیں شعروادب خصوصاً انگریزی و فارسی ادب میں ابتدا سے ہی دلچسپی تھی جسے ان کے استاد مولوی سید علی خاں صاحب بیتاب عظیم آبادی نے خوب جلا بخشی۔ بعد ازاں ان ہی کی ایما پر یگانہ کو مولانا سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی کے سپرد کر دیا گیا جن کی ذات گرامی سے انھیں بہت فیض پہنچا۔ اسی تربیت کا اثر تھا کہ 1904 میں جب انھوں نے کلکتہ اور مٹیا برج کا سفر کیا، تب انھیں پرنس مرزا محمد مقیم بہادر (سلطان عالم حضرت

مرزا محمد واجد علی شاہ کے نواسے) کے مرشد زادوں یعنی محمد یعقوب علی میرزا اور محمد یوسف علی مرزا کی معلمی کا شرف ملا1۔

مٹیا برج کی مرطوب آب و ہوا نے ان کی صحت پر بہت منفی اثر ڈالا اور وہ سخت علیل ہو کر عظیم آباد واپس آگئے اور دہلی، آگرہ، اجمیر، الٰہ آباد، بنارس وغیرہ کی سیر و سیاحت کرتے رہے۔ مگر جب کسی طور صحت بحال نہ ہوئی تو 1905 میں علاج کی غرض سے لکھنؤ کے لیے عازم سفر ہوئے۔ سرزمین لکھنؤ اس قدر بھائی کہ یہیں کے ہو رہے۔ وقتاً فوقتاً عظیم آباد جاتے رہے اور جائداد کا کچھ کچھ حصہ فروخت کر کے لکھنؤ چلے آتے کہ یہاں کی رنگا رنگ اور چکا چوند سے بھری دنیا میں بے فکری سے زندگی بسر کر سکیں۔ اسی درمیان میں حسن اتفاق سے ایک دفعہ نواب سیّد محمد رضا خاں عرف نیّا صاحب موج عظیم آبادی علاج کی غرض سے لکھنؤ تشریف لائے جن سے ان کی بہت قربت تھی۔ انھوں نے ہی مرزا صاحب کی شادی لکھنؤ کے ایک معزز متوسط گھرانے میں کرا دی۔ اس طرح 1913 میں حکیم مرزا محمد شفیع کی بیٹی کنیز حسین سے ان کا نکاح ہو گیا۔ ان کے خسر محترم لکھنؤ کے نامور حکما میں تو تھے ہی انھیں علم و ادب سے بھی گہرا شغف تھا۔ جس کا ثبوت ان کی مرتبہ کتاب ''مباحثۂ گلزار نسیم یعنی معرکۂ چکبست و شرر'' (مطبع نول کشور، لکھنؤ 1913) سے فراہم ہوتا ہے۔ پیش ہے ان کا سسرالی شجرۂ نسب جس سے کئی باتیں واضح ہوتی ہیں۔

---

1 گو کہ اس سے قبل بھی مرزا کو اس قسم کا تجربہ تھا۔ دوران تعلیم بھی انھیں مالی بحران سے نجات پانے کے لیے ٹیوشن پڑھانا پڑا تھا اس زمانے میں ان کے شاگرد ابوالحسن خاں تھے جو نواب سید رضا علی خاں رضا جو کہ سنگی دالان پٹنہ کے رئیس تھے کے اکلوتے بیٹے تھے۔ جو مرزا کی تربیت اور فیض سے آرزو تخلص کے ساتھ شاعری بھی کرنے لگے تھے۔ نواب سید رضا علی خاں رضا صاحب دور اندیش واقع ہوئے تھے اور انھوں نے یگانہ کی ضرورتوں کے تحت انھیں دس روپے ماہانہ اور کھانہ، ناشتہ کے ساتھ ساتھ سنگی دالان ہی میں رہائش کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ لیکن اتنے میں ان کی کفالت ممکن نہیں تھی۔ اسی وجہ سے پہلے تو وہ کلکتہ گئے کہ بہتری کی کوئی صورت پیدا ہو مگر کامیابی نہ ملی بعد کو مٹیا برج چلے گئے۔

کنیز حسین کی والدہ ماجدہ بنارس کی رہنے والی تھیں ان کا نام بھی کنیز فاطمہ تھا ان کے پردادا حکیم میر محمد باقر بنارسی تھے کنیز فاطمہ انہی کے بیٹے حکیم محمد امیر کی بیٹی تھیں جن کا عقد حکیم مرزا محمد شفیع کے ہمراہ ہوا تھا۔ کنیز حسین اور مرزا یگانہ کی کئی اولادیں ہوئیں جن کی تفصیل انھوں نے اپنی ایک بیاض (بیاض شمار: 2، مملوکہ بلند اقبال بیگم) میں ''تفصیل ولادت'' کے عنوان کے تحت درج کی ہے۔ مشفق خواجہ کی ترتیب کردہ ''کلیات یگانہ'' کے حوالے سے تفصیل کچھ یوں ہے:

(1) بلند اقبال حُسن بانو۔ 4/5 ذی الحجہ 1334ھ بمطابق 3/اکتوبر 1916، وقت آٹھ بجے دن، یوم سہ شنبہ، مقام جھنوائی ٹولہ لکھنؤ۔

(2) آغا جان، 23/ذی الحجہ 1339ھ بمطابق 1920، یوم دوشنبہ، 9 بجے شب، باغ قاضی، لکھنؤ۔

(3) اُمِ صغریٰ، یکم فروری 1924 بمطابق 1342ھ، یوم جمعہ، وقت صبح، بمقام شاہ گنج لکھنؤ۔ وفات یکم محرم 1348ھ (بمطابق 9/جون 1929) شاہ گنج لکھنؤ۔

(4) مریم جہاں 13/محرم 1344ھ بمطابق 24/جولائی 1926، یوم شنبہ، دو بجے دن، لاہور۔

(5) حیدر بیگ، شب یک شنبہ، 17/ذی الحجہ 1348ھ بمطابق 17/مئی 1930 عثمان آباد۔

(6) عامرہ بیگم، یوم سہ شنبہ پونے پانچ بجے صبح، 14/محرم 1350ھ بمطابق 27/جون 1931 عثمان آباد۔

واضح رہے کہ یگانہ کو اپنی زندگی میں ایک کمسن بچہ کی موت کا غم بھی سہارنا پڑا جس کا نام آغا شکوہ رکھا گیا تھا یہ ان کی بڑی بیٹی بلند اقبال یعنی حسن بانو سے پہلے پیدا ہوا تھا، بلند اقبال بیگم کے مطابق وہ پندرہ بیس روز کے بعد ہی فوت ہو گیا تھا۔ ان ہی کا بیان ہے کہ ان سے پیشتر بھی ان کے دو بچے ضائع ہو چکے تھے۔ شاید اسی بنا پر یگانہ نے اپنی اولاد کی مذکورہ فہرست میں اسے شامل نہیں کیا ہے۔ لیکن ''آیات وجدانی'' طبع اوّل وطبع سوم میں خاندانی شجرہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے آغا شکوہ کا نام درج کیا ہے۔ جس سے بلند اقبال بیگم کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ وہ دور ہے جب یگانہ لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار میں اپنی شاعرانہ عظمت کا سکہ جمانے لگے تھے۔ لیکن یہ کوئی مستقل ذریعہ معاش نہ تھا اور وہ تلاش معاش میں سرگرداں تھے۔ اسی دوران یگانہ کو اپنے خسر حکیم مرزا محمد شفیع شیرازی کی سفارش کے طفیل ''اودھ اخبار'' کی ملازمت ملی جن کے نول کشور پریس والوں سے گہرے تعلقات تھے۔ ''اودھ اخبار'' سے یگانہ کی وابستگی کا سراغ 1912 کی ایک تحریر سے بھی ملتا ہے جو انھوں نے اپنے مخالفوں کے خلاف ایک مضمون کی شکل میں شائع کرایا تھا۔ یہ بقول خود ان کی جانب سے ''پہلی چشم نمائی'' تھی۔ یگانہ ''اودھ اخبار'' سے وابستہ رہے، یہ تو طے ہے پر یہ وابستگی کب سے کب تک تھی۔ اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں ''سوانح منشی نول کشور'' از امیر حسن نورانی، خدا بخش پبلک اورینٹل لائبریری، پٹنہ 1995، صفحہ 143 اور ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کے مضمون ''منشی نول کشور کا مطبع'' ماہنامہ ''نیا دور'' لکھنؤ، نومبر دسمبر 1980 صفحہ 63 سے رہنمائی ملتی ہے ان دونوں ہی نے یگانہ کا شمار ''اودھ اخبار'' کے مدیروں کی فہرست میں کیا ہے۔ اسی طرح 1914 میں ''نشتر یاس'' شائع ہوئی تو اسی سال 23/اپریل کے شمارے میں اس پر ایک تعریفی تبصرہ شائع ہوا تھا۔ اس کی نقل ماہ نامہ ''نقاد'' آگرہ، بابت اکتوبر 1914 میں شائع ہوئی۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ 1912 سے یگانہ کا ''اودھ اخبار'' سے تعلق ضرور رہا۔

یگانہ نے اپنی تحریروں میں دو جگہ ''اودھ اخبار'' سے اپنی وابستگی کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو 4/نومبر 1920 کے اس مطبوعہ گشتی مراسلے میں جو یگانہ نے رسالہ ''کار امروز'' کے اجرا کے سلسلے میں لکھا تھا اور جس میں ''اودھ اخبار'' کی ملازمت کی وجہ سے اپنے عدیم الفرصت ہونے کا ذکر کیا

ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ 1920 کے آخر تک وہ لازماً اس اخبار سے منسلک تھے۔ دوسری مرتبہ ''غالب شکن'' (طبع اوّل 1934) کے دیباچے میں اس اخبار کا ذکر ملتا ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ لکھنوی حریفوں کی وجہ سے انھیں ''اودھ اخبار'' کی ملازمت چھوڑنی پڑی۔ یہاں ضمناً انھوں نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان کی تنخواہ ساٹھ روپے ماہوار تھی۔ تصدیق کے لیے مرزا یگانہ چنگیزی سے متعلق بشیشر پرشاد منور لکھنوی کا ایک بیان ملاحظہ فرمائیں جس میں ''اودھ اخبار'' سے ان کے تعلق کا سراغ ملتا ہے:

> ''...... یاس عظیم آبادی لکھنؤ میں کافی عرصے تک ''اودھ اخبار'' لکھنؤ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہے جس کے چیف ایڈیٹر اس وقت میرے رہنمائے سخن منشی نوبت رائے نظر کے سپرد تھی۔ یہ زمانہ 20-1919 کا تھا۔ اودھ اخبار میں میرا کلام چھپتا رہتا تھا۔''1

واضح رہے کہ جب عزیز لکھنوی اور ان کے ہم نواؤں کی سرپرستی میں رسالہ ''معیار'' جاری ہوا اور ''انجمن معیار ادب'' وجود میں آئی تب یگانہ بھی ان مشاعروں میں غالب کی زمینوں میں غزلیں پڑھتے تھے۔ غزل پیش کرنے کے لیے انھوں نے ایک خاص لحن ایجاد کر رکھا تھا۔ ان کا طریقہ یہ تھا وہ اکثر اشعار کو مکرر پڑھتے، ایسے میں ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی جس سے نہ صرف حاضرین مشاعرہ لطف اندوز ہوتے بلکہ وہ خود بھی خوب لطف اٹھاتے۔ بقول مجنوں گورکھپوری وہ جس مشاعرے میں اپنا کلام سناتے تھے تو مشاعرہ برخاست ہونے کے بعد جس طرح لوگوں کی زبان پر یاس کے اشعار ہوتے تھے، دوسرے اساتذہ کے اشعار بہت کم ہوتے تھے کہ ان کو یکسوئی سے پڑھا جائے اور ان پر تھم تھم کر غور کیا جائے اور ان کی تہ در تہ معنویت کو سمجھا جائے۔ اس قول سے بھی یگانہ کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ کی ورق گردانی کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان طرحی مشاعروں کی جو غزلیں رسالہ ''معیار'' میں شائع ہوئی ہیں، ان میں یگانہ کی غزلیں بھی خاصی تعداد میں شامل ہیں۔ افسوس کہ یگانہ اور شعرائے لکھنؤ کے درمیان موانست کا یہ رشتہ زیادہ عرصے تک باقی نہ رہ سکا اور معاصرانہ چشمک کا آغاز ہو گیا۔ بقول یگانہ اس کا سبب یہ تھا

---

1. مرزا یگانہ چنگیزی: میرا ذاتی تاثر، ماہنامہ ''ہمایوں'' اپریل 1967 صفحہ 243

کہ معیار پارٹی کے مشاعروں میں ان کے کلام پر خندہ زنی کی جاتی تھی اور بے سر و پا اعتراض کیے جاتے تھے۔ مگر یہ سب کچھ زبانی ہی ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں یگانہ نے ہی تحریری جنگ کا آغاز کیا اور ''1912 میں میرے ایک دوست کی طرف سے کچھ اعتراضات اہلِ معیار کے کلام پر 'اودھ اخبار' میں شائع ہوئے۔'' (خودنوشتِ یاس، قلمی، ص6)۔ یہ مضمون دراصل خود یاس نے لکھا تھا، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ خودنوشت میں جہاں اس مضمون کا تذکرہ ہے، وہاں حاشیہ پر بقلم یاس یہ عنوان بھی ہے: ''میری طرف سے پہلی چشم نمائی۔'' بقول مرزا یگانہ ۔

ادب کے واسطے کتنوں کے دل دکھائے ہیں
یگانہ حد سے گزرنا نہ تھا مگر گزرے

ان کے اس حد سے گزرنے کے بعد دونوں ہی جانب سے جواب الجواب ایک دوسرے کے خلاف لکھنے کا سلسلہ جاری ہوگیا جس کی انتہا یگانہ کی کتاب ''شہرت کاذبہ'' ہے۔ اسے ہی ''خرافات عزیز'' کے نام سے بھی شہرت ملی۔ یہ ادبی معرکہ آرائی تقریباً بیس برس تک جاری رہی۔ اسی پاداش میں انھیں کئی قسم کی نازیبا سلوک کا سامنا بھی کرنا پڑا حتیٰ کہ ان کی نوکری بھی جاتی رہی۔ یگانہ کی زندگی کا یہ سب سے نازک دور ہے اس دور میں جو کہ 1923 سے 1929 پر محیط ہے انھیں شدید معاشی بحران سے بھی گزرنا پڑا[1]۔ دیکھیں یہ بیان جس میں انھوں نے اپنے مخالفین کو یزیدی فوج سے تعبیر کیا اور اپنی ثابت قدمی کو حسینی شیوہ قرار دیا ہے۔ بقول یگانہ:

> ''الحمدللہ کہ میں اپنی جگہ پر قائم ہوں۔ لکھنؤ کی یزیدی فوج کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا، اپنے حسینی مسلک سے پیچھے نہ ہٹنا...... ہزاروں فتح سے بڑھ کر ہے۔''[2]

---

1. منقول ہے کہ جب ''شہرت کاذبہ'' شائع ہوئی تو جناب عزیز لکھنوی کے شاگردوں نے ان کے خلاف کئی قسم کی نازیبا حرکتیں شروع کردیں۔ جوش ملیح آبادی بھی عزیز کے عزیز شاگردوں میں تھے۔ انھیں اپنے استاد کی ہتک اور توہین کب برداشت ہوتی۔ لہٰذا یگانہ کو پریشان کرنے کے جہاں اور کئی طریقے اپنائے گئے انھی میں سے ایک طریقہ جوش ملیح آبادی نے یہ بھی ایجاد کیا کہ اپنے اثر و رسوخ کی بدولت انھیں اودھ اخبار سے سبکدوش کرادیا۔ جو مطبع نول کشور سے شائع ہوتا تھا۔ اس طرح یگانہ کو سماجی و معاشی دونوں محاذوں پر نبرد آزما ہونا پڑا۔
2. یاس یگانہ: شہرت کاذبہ صفحہ 34

اس ضمن میں ان کا تحریر کردہ ایک اور اقتباس پیش کیا جارہا ہے جس میں ان کی روشن ضمیری پرتو روشنی پڑتی ہی ہے، اس میں غالب پر کھل کر چوٹیں بھی کی گئی ہیں جو ان کے جیسا کوئی بے باک شخص ہی کر سکتا تھا:

"بغض وعداوت کی قربان گاہ پر وجہ معاش کو بھینٹ چڑھادینا بال بچوں پر سختیاں اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور صبر کرنا عمر بھر کا سرمایہ ایک اچھا خاصہ کتب خانہ بے روزگاری کے ہاتھوں تنگ آکر کوڑیوں کے مول لٹا دینا......اپنی ضمیر پرستی کے ہاتھوں الٹا مورد الزام ہونا...... غالب جیسے خود غرض ، پیٹ کے بندے، خلعت کے بھوکے، انگریزوں کے پنشن خوار کا کام نہیں ہے۔"[1]

یہ وہ الفاظ ہیں جن میں مرزا یگانہ کی زندگی کی ایک اہم داستان حیات چھپی ہوئی ہے۔ اسی کو انھوں نے اپنے ایک شعر میں یوں منتقل کیا ہے ۔

وطن کو چھوڑ کر جس سرزمیں سے دل لگایا ہے
وہی اب خون کی پیاسی ہوئی ہے کربلا ہو کر

اس شعر میں عظیم آباد سے ہجرت کا درد تو جھلک ہی رہا ہے۔ یہ بات بھی صاف صاف نظر آرہی ہے کہ جس کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا کر وہ لکھنؤ آئے تھے وہی سرزمین اب ان کے لیے کرب و بلا بن گئی ہے، اسی سرزمین پر انھیں آوارہ وطن بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کے نام 12 دسمبر 1924 کو لکھے ایک خط کا یہ اقتباس درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ قارئین اس سے ان حالات کا اندازہ لگا سکیں جن سے یگانہ نبرد آزما تھے:

"لکھنؤ نے تو میری وہ قدر کی کہ سبحان اللہ۔ غلیظ گالیاں ، ناپاک ہجویں، آبرو ریزی کی فکریں، جھوٹی اور مجرمانہ افتراپردازیاں میرے لیے جائز ہی نہیں بلکہ فرض سمجھ لی گئیں۔ یہی نہیں بلکہ میری روزی پر حملہ کر کے مجھے پریشان روزگار بنا کر کلیجہ ٹھنڈا کیا گیا۔ تنگ دستی کے ہاتھوں مجھے اپنی عمر بھر کا

---

1. یاس عظیم آبادی: غالب شکن، دوآتشہ صفحہ 12-11

سرمایہ یعنی کتب خانہ تک کوکوڑیوں کے مول بیچ کر سر بہ صحرا ہونا پڑا۔" [1]

اسی سے ملحق ایک اور اقتباس جس سے یگانہ کی ذہنی کوفت کا اندازہ ہوتا ہے:

"میری زندگی کچھ ایسے تلخ و ناگوار واقعات کے سلسلۂ لا متناہی میں جکڑی ہوئی ہے اور ایسی بے سروسامانی، تنگ دستی، پراگندہ دلی و مکروہاتِ گونا گوں اور صعوبات روز افزوں کا سامنا رہتا ہے کہ جمعیت خاطر کی امید بڑھتی (بندھتی؟) نہیں دکھائی دیتی..... اطمینان و فراغ نہ پہلے حاصل تھا نہ اب میسّر ہے۔ پھر آئندہ کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔ پراگندگی خاطر کا سلسلہ یوماً فیوماً بڑھتا ہی جاتا ہے، زمانۂ حال کی روش دیکھتے ہوئے مستقبل اور بھی تاریک نظر آتا ہے۔" [2]

اسی پر بس نہیں کہ ان کی نوکری پر بن آئی اور تمام اثاثہ فروخت ہونے لگا بلکہ طرّہ یہ کہ مشاعروں میں بھی ان کا بائیکاٹ کیا جانے لگا اور کئی شعرا نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ان مشاعروں میں ہرگز شرکت نہیں کریں گے جن میں یگانہ مدعو ہوں گے۔ دیکھیں سید اعظم حسین اور مکیش اکبرآبادی کے تحریر کردہ یہ اقتباسات جن سے یہ بات مترشح ہوتی ہے۔

"مرزا غالب دہلوی کے بارے میں ان کے معاندانہ اشعار پڑھ کر ان سے ایک طرح کی بیزاری دل میں پرورش پاتی رہی۔ ان اشعار میں صرف اپنی لنترانی اور غالب کی ہجو ہوتی تھی۔ کوئی ایسی قابل لحاظ تنقید نہیں ہوتی تھی جس سے ان کے سنجیدہ غور و فکر کا ثبوت ملتا۔" [3]

"مشاعرہ میں فانی صاحب کے ساتھ میں پہنچا تو منتظمین نے ہمیں ایک مخصوص جگہ لے جا کر بٹھا دیا۔ میں نے دیکھا میرے پاس فانی صاحب کے پیچھے جگر صاحب تشریف فرما ہیں اور سرخوشی کے عالم میں جھوم رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے اس کے پاس سے ہٹ بیٹھئے۔

---

1. نقوش: مکاتیب نمبر حصہ دوم نومبر 1957 صفحہ 701
2. مراسلہ بہ عنوان: "کار امروز (لکھنؤ کا ماہنامہ ادبی رسالہ) پیغام عمل مورخہ 4 نومبر 1920 صفحہ 2
3. سید اعظم حسین: نقوش (شخصیات نمبر) صفحہ 68-866

مرزا یگانہ کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ جگر صاحب کہنے لگے، میکش ہم میں ہے۔ تم میں نہیں ہے۔ یگانہ صاحب کہنے لگے دیکھئے یہ شخص یہاں بھی شیعہ سنی کا سوال پیدا کر رہا ہے۔ جگر صاحب نے فرمایا۔ نہیں یہ شیعہ سنّی کا سوال نہیں ہے یہ شاعر اور غیر شاعر کا سوال ہے، میکش شاعر ہے۔ تم شاعر نہیں ہو۔ ہٹ کے بیٹھو میکش کے پاس سے۔"[1]

ایک طرف تو زمانے کا یہ انداز کہ انھیں شاعر ہی نہ گردانا جا رہا ہو تو دوسری طرف ان کا یہ کہنا کہ وہ غالب کے چچا ہیں اور بقول ان کے "غالب کے چچا کے آگے سب ڈھینڈس ہیں"۔ دیکھیں ان کی تصنیف آیات وجدانی کا یہ اقتباس جس سے اس امر پر مزید روشنی پڑتی ہے:

"سچ تو یہ ہے کہ اس صدی میں یگانہ کے سوا اور کسی کو شاعر سمجھنا محض خود فریبی ہے۔"[2]

مرزا یگانہ کے بیان کردہ کوائف سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ "اودھ اخبار" کی ملازمت چھوٹنے سے قبل بھی وہ تکلیف دہ اور ناخوش گوار حالات سے نبرد آزما تھے۔ اور اس سے نجات پانے کے لیے انھوں نے کچھ دنوں تک ریلوے میں بطور کلرک کے بھی ملازمت کی۔ پیش ہے شمشیر پرشاد منوّر لکھنوی کے مضمون سے یہ اقتباس جو محکمۂ ریل ہی میں ملازم تھے:

"...... یاس عظیم آبادی ...... کچھ دنوں ریلوے آفس میں ملازم رہے لیکن سرکاری نوکری ان کے بس کی نہ تھی۔ شاید ریلوے آفس کی کلرکی کا کام ان کی افتادِ طبع کے مطابق نہ تھا۔ یہ تو یاد نہیں کہ انھوں نے ریلوے اکاؤنٹس آفس میں کتنے دنوں کام کیا، لیکن دفتر میں ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔"[3]

اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام یقیناً ان کی افتادِ طبع سے میل نہیں کھاتا تھا۔ یگانہ چنگیزی لکھنوی یوپی کے نہ ہو کر اصلاً بہار کے رہنے والے تھے اور خود کو زبان و بیان کے اعتبار سے

---

1. میکش اکبر آبادی، یگانہ چنگیزی کے ساتھ چند لمحے، ہفتہ وار "بے داغ" دہلی سالنامہ جنوری 1959 صفحہ 7
2. مرزا یگانہ: آیات وجدانی، طبع سوم صفحہ 88
3. مرزا یگانہ چنگیزی: میرا ذاتی تاثر، ماہنامہ "ہمایوں" اپریل 1967 صفحہ 241

اپنے ہمعصروں میں سب سے بہتر سمجھتے تھے۔جس کا ثبوت وہ ''چراغ سخن'' کے ذریعہ بھی دے چکے تھے۔مخالفت کی یہ بھی ایک بڑی وجہ رہی ہو تو بعید نہیں۔مگر یگانہ کو یہ بات بخوبی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اب حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہیں کہ وہ مجبوراً ہی سہی لکھنؤ کو خیر باد کہیں۔اسی لیے وہ 1924 میں اٹاوہ چلے گئے۔دراصل اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے ہیڈ ماسٹر مولوی الطاف حسین یگانہ کے بڑے قدر دان تھے۔ان ہی کی ایما پر انھوں نے اسلامیہ ہائی اسکول میں ملازمت اختیار کی۔لیکن ابھی بھی صحافت ان کی رگوں میں جوش مار رہی تھی شاید اسی جذبہ کی تسکین کی خاطر یہاں سے انھوں نے ایک رسالہ ''صحیفہ'' جاری کیا جس کا پہلا اور آخری شمارہ جنوری 1925 میں شائع ہوا۔واضح رہے کہ یگانہ کسی کی مدح ذرا کم ہی کرتے تھے لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ مولوی الطاف حسین کی مدح میں انھوں نے دو رباعیاں لکھیں۔یہ وہی زمانے ہے جب اٹاوے میں فانی بدایونی اور جگر مرادآبادی جیسے شعرا بھی موجود تھے،مرزا یگانہ چنگیزی کے ان دونوں ہی شعرا کے ساتھ بہت اچھے مراسم قائم ہو گئے تھے اور یہ بھی مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔لیکن بہت جلد وہ یہاں سے بھی اوب گئے اور بالآخر اٹاوہ کو بھی خیر باد کہا۔وہ یہاں ستمبر 1924 سے مارچ 1925 تک مقیم رہے۔

یہاں سے انھوں نے علی گڑھ کی طرف کوچ کیا۔بقول بلند اقبال بیگم یہاں ان کا قیام تقریباً چھ ماہ تک رہا۔یہاں بھی انھیں ایک پریس میں ملازمت مل گئی تھی۔ان کا قیام علی گڑھ ان معنوں میں اہم ہے کہ ان کی معرکتہ الآرا کتاب ''شہرت کاذبہ'' کی اشاعت کا آخری مرحلہ یہیں طے ہوا۔اس کتاب کا متن تو لکھنؤ میں پہلے ہی طبع ہو چکا تھا،صرف سرورق کا شائع ہونا باقی تھا جسے انھوں نے علی گڑھ میں شائع کرا کر اشاعت کے مرحلے سے گزارا۔

1926 ان کی زندگی میں کچھ یوں اہم ہے کہ اسی سال لاہور کے مشہور اشاعتی ادارے میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز میں انھیں ملازمت مل گئی۔اس لیے انھوں نے پہلے لاہور کی جانب رخ کیا بعد کو حیدرآباد دکن چلے گئے جو ادب کا ایک اہم مرکز تھا۔دراصل اس ادارے نے مولانا تاجور نجیب آبادی کی سرپرستی میں ''اردو مرکز'' کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا تھا جس کا مقصد اردو ادب کی تمام اصناف کے انتخابات شائع کرنا تھا۔اس کام کے لیے ''اردو مرکز'' نے

اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی اور یگانہ چنگیزی کا انتخاب تاجور نجیب آبادی کے معاونین کے طور پر کیا تھا جبکہ اس کی مجلس مشاورت میں شیخ عبدالقادر، پنڈت موہن دتا تریہ کیفی اور خان بہادر شیخ نور الٰہی جیسی شخصیات شامل تھیں۔ ابتداً اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی اور یگانہ چنگیزی تینوں اہل قلم لاہور کے ایک ہی مکان میں مقیم رہے۔ لیکن جب یگانہ کے اہل خانہ بھی لاہور آ گئے تو وہ الگ مکان میں منتقل ہو گئے۔

قیام لاہور یگانہ کی زندگی کا نہایت اہم موڑ یوں ہے کہ اسی دوران ان کے تعلقات لاہور میں موجود تقریباً تمام اہم اشاعتی اداروں خصوصاً رسالوں کے مدیروں اور ادیبوں سے قائم ہو گئے۔ لاہور کے جن ادیبوں سے مرزا یاس یگانہ چنگیزی کے خصوصی مراسم تھے ان میں عبداللطیف تپش، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، خواجہ دل محمد وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے علاوہ عابد علی عابد اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم جیسے ادیبوں سے بھی ان کے تعلقات قائم ہوئے۔ اسی درمیان دوارکا داس شعلہ اور مالک رام سے بھی مراسم کا آغاز ہوا۔ جن کا شمار ان کے محسنوں میں ہوتا ہے، اوّل الذکر نے تمام عمر ان کی مدد کی جبکہ ثانی الذکر نے آخری زمانے میں۔ یگانہ کو اشاعتی اداروں سے تعلقات کا صلہ یہ ملا کہ ان کے مجموعہ ''آیات وجدانی'' اور ''ترانہ'' کی طباعت کا مرحلہ آسان ہو گیا۔ اور مدیروں سے روابط کی بنا پر ان کے مضامین ''نیرنگ خیال''، ''عالم گیر'' اور ''شباب اردو'' وغیرہ اہم رسائل میں شائع ہونے لگے جس سے انھیں ہندستان گیر شہرت ومقبولیت حاصل ہونے لگی۔ یہ وہی دور ہے جب اختر شیرانی ان کے مداح اور قدردان بن کر ابھرے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب 1926 میں انھوں نے اپنا رسالہ ''بہارستان'' جاری کیا تو مئی سے اکتوبر تک کے تقریباً سبھی شماروں میں ان کی غزلیں شائع کیں۔

لاہور میں قیام کے دوران یگانہ کے تعلقات علامہ اقبال سے بھی تھے۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے مطابق علامہ اقبال کے دولت کدے پر کبھی کبھی جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی، یاس یگانہ چنگیزی اور سیماب اکبرآبادی وغیرہ جمع ہوتے تھے۔ یگانہ اس زمانے میں اقبال کے خلاف نہیں تھے۔ اس کے شواہد ''آیاتِ وجدانی'' طبع اوّل (1927) میں بھی مل جاتے ہیں کہ اس میں انھوں نے علامہ محمد اقبال کا نام بڑے ادب سے ''ڈاکٹر سر محمد اقبال بالقابہ'' لکھا ہے۔

دیکھیں یہ اقتباس جس سے علامہ کے تئیں ان کے عقیدت واحترام کی جھلک نمایاں ہے:

''ڈاکٹر اقبال نے فلسفۂ خودی کی جو تعلیم دی ہے، وہ محض نظری حیثیت رکھتی ہے، اس اعتبار سے ان کی مثنوی اسرار خودی ہمارے علم وادب کے لیے مایۂ ناز ہے۔''[1]

ظاہر ہے اقبال بھی یگانہ کے کچھ کم قدر دان نہ تھے خصوصاً وہ ان کی زبان دانی کے معترف تھے۔ اس کا ثبوت کچھ یوں فراہم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ زبان کے معاملے میں کسی نے رہنمائی چاہی تو اقبال نے جواب میں یاس اور عزیز لکھنوی کے پتے لکھے اور کہا کہ ان سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ بہر حال اردو مرکز سے یگانہ کی وابستگی 1927 کے اوائل تک ہی برقرار رہ سکی کہ میسرز عطر چند کپور نے اس ادارے کی مالی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس طرح ادارے کا قائم رہنا مشکل ہو گیا۔ یگانہ کی اس ادارے سے علاحدگی کی ایک وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ اسی زمانے میں اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی سے یگانہ کی ان بن ہو گئی تھی۔ مرزا یگانہ نے بھی ''آیاتِ وجدانی'' طبع اوّل میں فارسی غزل...... گوش بردیوار ما، پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ہم زاد مرزا مراد بیگ شیرازی کی زبانی ایک جگہ کچھ یوں اشارہ کیا ہے:

''اوّل کے تین اشعار میں غالباً ان مکار، حاسدوں کی چشم نمائی کی گئی ہے جو یوپی سے لاہور آ کر مرزا صاحب کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔''[2]

اردو مرکز سے علاحدگی کے بعد بھی مرزا یگانہ کچھ عرصے تک لاہور میں مقیم تھے۔ اور مولانا حفظ الرحمٰن منہاس کے لیے کام کرتے رہے جنھوں نے ''حفظ العلوم'' کے نام سے ایک اردو انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب کا کام شروع کر رکھا تھا۔ انھوں نے چنگڑ محلے (لاہور) میں یگانہ کو ایک مکان رہائش کے لیے دیا تھا۔ یگانہ کو شاید مرزا فہیم بیگ چغتائی کی ایما پر یہ کام ملا تھا جو خود بھی منہاس صاحب کے پاس ملازم تھے۔ یگانہ انسائیکلو پیڈیا کا کام بھی کرتے رہے اور گاہے گاہے لکھنؤ بھی جاتے رہے۔ اسی دوران ان کی دوسری بیٹی مریم جہاں 24/جولائی 1926 کو پیدا ہوئی۔

---

1. یاس یگانہ چنگیزی: آیات وجدانی طبع اول، لاہور 1927 صفحہ 56
2. یاس یگانہ چنگیزی: آیات وجدانی طبع اول، لاہور 1927 صفحہ 105

یگانہ جولائی 1927 تک لاہور میں مقیم رہے۔ پھر 1927 کے اواخر میں حیدرآباد دکن چلے گئے۔ جہاں نثار احمد مزاج (جو بعد میں نواب نثار یار جنگ ہوئے) کی سفارش پر محکمۂ رجسٹریشن کے ناظم بشیر یار جنگ نے انھیں عثمان آباد میں اپنے محکمے میں نقل نویس مقرر کر دیا۔ لیکن انھیں ابھی بھی مالی بحران کا سامنا تھا اور یہ اس وقت تک رہا جب تک کہ وہ مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی وساطت سے محکمۂ رجسٹریشن میں سب رجسٹرار کے طور پر باقاعدہ ملازم نہ ہو گئے۔ جد و جہد کی اس داستان کو انھوں نے ایک زمانے تک اپنے نام کا لازمی حصہ بنائے رکھا۔ اس امر سے ہم سبھی واقف ہیں کہ یہ عہدہ پانے کے بعد جب کبھی کسی رسالے میں ان کی غزل یا مضمون شائع ہوتا، نام کے ساتھ یہ عہدہ ضرور لکھا جاتا تھا۔ اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عالم طفلی میں انھوں نے اس عہدے پر فائز اس شخص کو دیکھا اور اس کے متعلق سنا تھا جو سب رجسٹرار کی حیثیت سے بیع نامہ کی رجسٹری کرنے کے لیے ان کے گھر پر آئے تھے، اور اس شاہی عطیہ کے تلف ہونے پر ایک کہرام برپا تھا۔ چہ جائیکہ یہ ایک معمولی عہدہ تھا جس کی تنخواہ آغاز میں چالیس روپے اور 1939 تک بڑھتے بڑھتے پچھتر روپے سے کچھ زائد نہ ہو پائی تھی۔ وہ اسی میں خوش تھے ورنہ چاہتے تو اس میدان میں مزید ترقی کی راہیں ہموار کر لیتے لیکن اس میدان میں بھی ترقی نہ پا سکے۔ اس کی ایک وجہ ان کے مزاج کی تندی اور جھگڑالو پن بھی تھا کہ وہ اکثر اپنے حکام سے بھی دست و گریباں ہو جاتے جس کی وجہ سے ترقی کے امکانات ختم ہو جاتے۔

مرزا یگانہ عثمان آباد میں 1933 تک رہے، یہاں سے ان کا تبادلہ لاتور ہو گیا جہاں 1937 تک ان کا قیام رہا۔ 1938 میں سیلو چلے گئے۔ 42-1941 میں وہ یادگیر میں تھے وہیں سے 1942 میں 55 برس کی عمر میں سبکدوش ہو گئے۔ اس نوکری سے سبکدوشی سے قبل بھی جب پرنس معظم جاہ نے انھیں اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تو اسے درباری بننے سے مترادف سمجھ کر قبول نہیں کیا یعنی اپنے ضمیر کی سنی۔ اور سبکدوش ہونے کے تین برس بعد پھر لکھنؤ واپس آ گئے اور ٹاپے والی گلی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ انھیں لکھنؤ سے ایک خاص لگاؤ تھا جس کی وجہ سے ہی وہ یہاں آئے تھے لیکن انھیں بہت جلد یہ محسوس ہونے لگا کہ فضا سازگار نہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے معاصرین اور ان کے شاگردوں کو یہ ڈر ستائے جا رہا تھا کہ جس شخص نے ہمارے بزرگوں کو

نہیں بخشا وہ ہما شما کو کب خاطر میں لائے گا۔ بہر حال ان کی پنشن پندرہ روپے ماہ وار مقرر ہوئی تھی جس میں بھرا پورا گھر چلانا دشوار تھا۔ لہٰذا اہل وعیال کو لکھنؤ میں چھوڑ کر یگانہ نے ایک مرتبہ پھر تلاش روزگار کی خاطر حیدرآباد دکن کا رخ کیا لیکن برسوں بعد بھی کامیابی مقدر نہ بن سکی۔ آخر کار وسط اپریل سے وسط مئی 1946 کے درمیان یگانہ چنگیزی ممبئی میں مقیم رہے۔ یہ سفر کچھ یوں کامیاب رہا کہ وہاں ہندستانی ریڈیو نشریات کے بابا آدم ذوالفقار علی بخاری کی وساطت سے اپنے بڑے بیٹے آغا جان کو ریڈیو میں ملازمت دلوائی نیز ''گنجینہ'' کا مسودہ تیار کر کے ترقی پسند تحریک کے بانی و مبانی سید سجاد ظہیر کو طباعت کے لیے سونپ دیا تا کہ اسے کمیونسٹ پارٹی کے قومی دارالاشاعت سے شائع کرایا جاسکے۔ اس دوران ''آیاتِ وجدانی'' کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہوگیا جس کی طباعت کا کام 1945 سے ہی جاری تھا۔ مرزا یگانہ اکتوبر 1946 کے آخر تک حیدرآباد میں رہے اور پھر لکھنؤ چلے گئے۔ مرزا یگانہ چنگیزی کے بار بار دورۂ حیدرآباد سے خیال گزرتا ہے کہ اس میں ان کا مالی مفاد ضرور پوشیدہ ہوگا۔ اس کا عندیہ 8/جون 1949 کے ایک خط سے بھی ملتا ہے۔ جسے انھوں نے لکھنؤ سے دوارکا داس شعلہ کے نام لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''بھئی اب تو میں پھر واپس (حیدرآباد) چلا، اگر چہ ہاتھ پاؤں کمزور ہو چکے ہیں۔ بات یہ ہے کہ تمھاری والدہ پر بہت سختیاں گزر رہی ہیں۔ میری پنشن وہی پندرہ روپے۔ لڑکے (پاکستان میں) نوکر تو ہیں مگر افسوس کی بات ہے کہ بہت کم توجہ کرتے ہیں...... میرے واپس (حیدرآباد) جانے کا بڑا سبب یہ ہے کہ کرایہ مکان دو سال 240 روپے کا سخت تقاضا ہو رہا ہے۔ 21/جولائی تک مہلت مانگی ہے۔ جا تو رہا ہوں لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہاں یہ رقم کیوں کر فراہم کرسکوں گا۔ حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ غالباً 15/جون تک روانہ ہو جاؤں گا۔''[1]

اس اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حیدرآباد میں یگانہ کے کچھ چاہنے والے ایسے ضرور تھے جن سے انھیں امید دستگیری تھی۔ شاید ان ہی سے ان کو کسی نہ کسی طور تھوڑی بہت

---

1. خط بنام دوارکا داس شعلہ، مورخہ 26 مارچ 1949، تخلیقی ادب۔ 98-497

مالی آسودگی حاصل ہو جاتی ہوگی مگر مجموعی طور پر صورت حال نہایت مایوس کن ہی تھی ورنہ وہ مالک رام کے نام 16/جولائی 1946 کے خط میں اس قسم کے جملے نہ لکھتے ہیں:

''حیدرآباد میں بعض بعض حکام سے مجھ سے بھی شناسائی ہے۔ مگر یہ لوگ بس تھوڑی بہت میری شاعری ہی کی تعریف کردیا کرتے ہیں۔ کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ اس بات پر غور کرتا کہ یگانہ آخر زندہ کیوں کر ہیں۔ حالانکہ توجہ کرتے تو کوئی نہ کوئی وظیفہ یا مدد معاش کی صورت پیدا ہوسکتی تھی۔''[1]

اسی طرح 3/دسمبر 1946 کو شعلہ کے نام کے خط میں لکھتے ہیں!

''حیدرآباد میں چار سال کی مسلسل کوششوں کے باوجود کچھ بن نہ پڑا۔ مدد معاش کی کوئی صورت نہ نکلی۔ خالی ہاتھ آیا۔ اک شاعر اور مجھ ایسے شاعر کے حصے میں روایاتی ناکامی کے سوا اور کیا آسکتا۔''[2]

ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں روزگار کی امید میں یگانہ نے جو سات برس گزارے، وہ دربدری کے عالم میں ہی گزرے۔ اسے دربدری نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے کہ کبھی ان کا قیام نواب شہید یار جنگ کے مکان کے سرونٹس کوارٹر میں رہا تو کبھی غلام پنجتن کے ہاں، وہ کبھی علی اختر حیدرآبادی کے یہاں پڑے رہے تو کبھی سرکاری مسافر خانے میں پناہ گزیں ہوئے۔ جن لوگوں سے امیدیں وابستہ تھیں ان سے شدید مایوسی ہوئی، اور مایوسی کے عالم میں ان سبھی کے حوالے سے شعروں کے ذریعہ دل کا غبار نکالا گیا۔ ایسے میں انھیں یہ بھی نہ سجھائی دیا کہ ان میں ان کے وہ محسن بھی ہیں جنھوں نے ان کے آڑے وقت میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ یگانہ سے اس قسم کی احسان فراموشی کی امید قطعی نہیں تھی لیکن وقت نے انھیں کیا سے کیا بنادیا تھا یہ وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد حیدرآباد میں جو زمانہ گزرا، اس میں کچھ نئے لوگوں سے روابط قائم ہوئے تھے جیسے علی اختر حیدآبادی، علامہ رشید ترابی اور زیبا ردولوی

---

1. رسالہ نقوش لاہور، مکاتیب نمبر جلد دوم شمارہ 65و66 نومبر 1957 صفحہ 8-707
2. خط بنام دوارکاداس شعلہ، مورخہ 26 مارچ 1949، تخلیقی ادب صفحہ 491

وغیرہ۔ پرانے جاننے والوں میں فانی بدایونی اور نجم آفندی[1] سے تجدید ملاقات ہوئی۔ یہ سبھی ان کے دوست رہے تھے لیکن ان سے ویسی امیدیں نہیں برآئیں جن کی انھیں ضرورت تھی۔ حیدرآباد سے واپس لکھنؤ آکر مارچ 1950 میں یگانہ نے اپنی بیٹی عامرہ بیگم کی شادی کی۔ وہ بہت خوش تھے لیکن یہ خوشی بیٹی کی شادی کی تھی، مالی حالات کی خرابی بدستور تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان کی زندگی کے آخری پانچ برس (1951 تا وفات) نہایت کسمپرسی کے عالم میں گزرے۔ گوناگوں عوارض نے جن میں دمہ سرِفہرست تھا، ان کی زندگی اجیرن کردی تھی۔ برائے نام پنشن کیا ساتھ دیتی، البتہ جوش ملیح آبادی[2] کی کوششوں سے حکومت ہند نے سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کردیا، جس سے قدرے اشک شوئی ہوگئی۔ لیکن وہ اب ایسی کرب ناک تنہائی کے حصار میں تھے جس کا مداوا ممکن نہ تھا۔ دونوں بیٹے اور بڑی بیٹی پاکستان جاچکے تھے اور باقی دونوں بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں تھیں۔ 23/جولائی 1951 کو بیگم بھی پاکستان چلی گئیں۔ یگانہ اس تنہائی کی تاب نہ لاسکے اور بیوی بچوں کی محبت میں 28/اگست 1951 کو وہ خود بھی پاکستان جاپہنچے۔ کچھ دنوں کراچی میں رہے اور پھر بڑے بیٹے آغا جان سے ملنے پشاور گئے (جو ریڈیو پاکستان پشاور میں کام کرتے تھے) اور پھر چھوٹے بیٹے مرزا حیدر بیگ سے ملنے کاکول چلے گئے (جو ملٹری اکیڈمی کاکول میں لیبارٹری اسسٹنٹ تھے)۔ بلا اجازت ایسا کرنا وہاں کے ویزا قوانین کی خلاف ورزی تھی اسی بنا پر انھیں لاہور میں گرفتار کرلیا گیا۔ چونکہ انھیں صرف کراچی کے لیے ویزا ملا تھا اور انھیں اسی راستے سے

---

1. نجم آفندی اور مسعود حسن رضوی ادیب، یگانہ کے ان جیالے دوستوں میں ہیں جن سے یگانہ کی دوستی تادمِ مرگ نبھی۔ ورنہ بیخود جیسے کئی دوستوں نے تو بہت جلد ان سے ناطہ توڑ کر الگ راستہ اختیار کرلیا تھا۔ ادیب صاحب سے یگانہ کی قربت میں تب مزید اضافہ ہوا جب انھوں نے ہماری شاعری کے دوسرے ایڈیشن میں ان کے شعر کی شرح کرتے ہوئے ان کے فن کی تعریف کی۔ مرزا یگانہ، سے نجم آفندی کی نبھنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کو اپنا بھائی تصور کرتے تھے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ایک زمانے میں جب وہ دکن میں مقیم تھے تب ان دنوں ان کے اہل خانہ نجم آفندی کی نگہداشت میں ہی آگرہ میں قیام پذیر تھے۔

2. واضح رہے کہ یہ وہی جوش ہیں جنھوں نے ایک زمانے میں ان کی اس قدر مخالفت کی تھی کہ اپنے اثر و رسوخ سے انھیں ''اودھ اخبار'' کی نوکری سے سبکدوش کرادیا تھا۔

کھوکھرا پار ہوتے ہوئے ہندستان واپس لوٹ جانا چاہیے تھا۔اس لیے لاہور میں ان کی موجودگی غیر قانونی ثابت ہوئی۔اس طرح 2/دسمبر 1951 کو وہ عدالت میں پیش کیے گئے اور جرم ثابت ہونے پر قید تابر خاست عدالت کی سزا سنائی گئی۔اس دوران انھیں اکیس روز جیل میں بھی گزارنے پڑے۔

رہائی کے بعد یگانہ لاہور سے کراچی واپس تو آ گئے لیکن اس دوران پرمٹ کی میعاد بھی ختم ہو چکی تھی۔اس زمانے کے قانون کے مطابق ہندستانی شہریوں کا ''ویزا پرمٹ'' کی میعاد ختم ہونے سے پہلے اپنے ملک واپس آنا ضروری تھا، ورنہ شہریت ختم ہو جاتی تھی۔اس نئی صورت حال میں یگانہ اپنے وطن بھی واپس نہیں آ سکتے تھے کہ وہ اب اپنے وطن کی شہریت بھی گنوا چکے تھے۔بہ مشکل تمام ہندستانی ہائی کمیشن کے ایک ہمدرد ویزا پرمٹ آفیسر کی مہربانیوں کے طفیل انھوں نے ہندستان واپسی کا اجازت نامہ حاصل کیا۔اس طرح سات ماہ کے طویل قیام پاکستان کے بعد بلکہ یوں کہا جائے کہ بعد از خرابیِ بسیار وہ 17/اپریل 1952 کو بذریعہ ہوائی جہاز دہلی پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔انھوں نے 18 تاریخ کو دہلی میں ہی قیام کیا، اور 19/اپریل کو لکھنؤ پہنچے۔ذرا غور سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ قیام پاکستان نے انھیں نہ صرف ذہنی طور پر شکستہ کر دیا تھا بلکہ ان کی صحت کو بھی بے حد نقصان پہنچا تھا۔دیکھیں ان کے ایک مکتوب کا یہ حصہ جسے مورخہ 19/مئی 1952 کو مالک رام کو تحریر کیا گیا تھا، وہ لکھتے ہیں:

> ''......الغرض میں اپنی منزل مقصود تک پہنچ گیا۔27/اپریل سے بخار آنے لگا۔ڈاکٹر کا علاج شروع کیا۔بخار تو خیر جاتا رہا مگر کھانسی اور تنفس کا جو مرض ہے، جو سات مہینے تک پاکستان میں اور زور پکڑتا گیا، اس میں کوئی افاقہ محسوس نہیں ہوتا۔سینہ نہایت کمزور، ٹانگوں میں معلوم ہوتا ہے دم نہیں رہا...... میں اب تک اپنے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا کہ کیا ہونے والا ہے۔ بہر حال تنہا ہوں، آس پاس کوئی نہیں مگر خوشی سے مرنے کے لیے تیار ہوں۔ بن پڑے تو کچھ خرچ کے لیے بھی بھیج دیجیے۔''[1]

---

1. رسالہ نقوش لاہور، مکاتیب نمبر جلد دوم شمارہ 65، 66 نومبر 1957 صفحہ 711

اس سفر کی ناکامی اور صعوبتوں نے ان پر بہت حد تک منفی اثرات مرتب کیے، باقی کی رہی سہی کسر بیماری، تنہائی اور مالی پریشانیوں نے پوری کر دی۔ حالات نے یگانہ کی انا اور کج کلاہی کو کس قدر مجروح کر دیا تھا اس کا اندازہ مذکورہ خط سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ورنہ مالک رام کے سامنے اس بے تکلفی سے دست سوال دراز کرنا چہ معنی دارد؟.... کیا یہ باتیں یگانہ کے لیے اہمیت نہیں رکھتی تھیں، کیا ان کے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ یہ باتیں یقیناً اہم ہیں، لیکن اس کا تجزیہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ ایک ٹوٹا اور بکھرا ہوا آدمی ان نامساعد حالات میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

ایسے میں یگانہ کی ذہنیت بھی اثر انداز ہوگئی اور اسی ذہنی کیفیت میں انھوں نے وہ قابل اعتراض رباعیاں لکھ ڈالیں جو ان کی ذلت و رسوائی کا سبب بنیں۔ واقعہ یوں ہے کہ یگانہ میں ایک خاص قسم کی مذہب بیزاری، تعصب اور سخت گیری کا عنصر بھی پایا جاتا تھا دراصل اسی کو ہتھیار بنا کر، ان کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کر کے ایک سازش کے تحت یہ رباعیاں ان سے کہلوائی گئیں۔ ان سے دینوی حرمت کو تو نقصان پہنچا ہی مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو بھی ٹھیس پہنچی۔ جس کا فائدہ ملاؤں نے خوب اٹھایا جبکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ حقائق دینوی اور مذہبی امور سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کی نظر میں خدا اور بندے کے مابین روح اور ضمیر کی تسکین کا معاملہ اہم ہے اور اسی بنا پر جو شخص جن عقائد کو دل کی گہرائیوں سے قبول کر لے وہی اس کا مذہب ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ مذہب موروثی یا اوپر سے تھوپنے والی چیز قطعی نہیں ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی مذہب بیزاری، تعصب یا تنگ نظری محض دکھاوا تھی ورنہ وقت مرگ وہ دین اسلام پر اصرار نہ کرتے۔ بہر حال یگانہ اس معاملہ میں سادہ لوح واقع ہوئے اور انھیں یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ ایسا انھیں رسوا کرنے کی خاطر کیا جا رہا ہے ورنہ وہ ان رباعیوں کو ایک ذاتی خط کے طور پر نیاز فتح پوری کو روانہ ہی نہ کرتے، جسے نیاز صاحب نے من وعن مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے پاس بھیج دیا تھا۔ اور انھوں نے اپنے اخبار ''صدق'' میں سخت ترین اداریہ ''ایک شاتم رسول وطاعن قرآن مسلمان'' کے ساتھ اسے شائع کر دیا جس کی پاداش میں یگانہ کی بڑی درگت بنائی گئی کہ اس سے تمام مسلمان چراغ پا ہو گئے۔ دیکھیں اس خط کا یہ اقتباس جسے ''سرفراز'' کے حوالے سے یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔ یہ وہی اخبار ہے جو لکھنؤ میں شیعوں کی ترجمانی کے فرائض بھی انجام دیا کرتا تھا بلکہ آج بھی اس کے کئی اہم

شمارے شائع ہوتے رہتے ہیں:

ایک شاتم رسول وطاعن قرآن مسلمان

کل ہی ڈاک سے مجھے ایک لفافہ (منصور نگر سلطان بہادر روڈ، لکھنؤ) موصول ہوا۔ خط تین صفحہ کا ہے۔ جس کی ایک سطر بھی کوئی مسلمان بغیر اپنا خون کھولائے ہوئے اور بے انتہا جوش میں آئے ہوئے نہیں پڑھ سکتا، خط ایک نام کے مسلمان کا ہے جو شاید تو اصلاً بہاری ہے مگر اب مدت سے لکھنؤ پر مسلط ہے...... دوسرے مضمون روک کر خط کی چند سطریں جو نسبتاً لکھی ہیں دل پر شدید جبر کر کے ''صدق'' میں دے رہا ہوں تا کہ سب مسلمان خصوصاً شیعہ حضرات (اس لیے کہ اس بد بخت کا پیدائشی تعلق فرقہ شیعہ سے ہے) اسے پڑھیں اور اپنی ذمہ داری محسوس کریں کہ کس طرح اپنے اندر ایک آستین کا سانپ اور خبث مجسم کو پرورش کر رہے ہیں...... خط کا آغاز دو رباعیوں سے ہوتا ہے۔ پہلی رباعی کا صرف آخری مصرعہ قابل نقل ہے:

ہت تیرے مسلمان کی ایسی تیسی (تھو)

اب تو واقف کار ناظرین نے پہچان لیا ہوگا کہ یہ وہی شخص ہے جو کسی زمانے میں مرزا واجد حسین عظیم آبادی کہلایا اور مرزا غالب اور عزیز لکھنوی وغیرہ کے خلاف مسلسل اپنے خرافات شائع کرتا رہا اور پھر ترقی کر کے اقبال کے خلاف اس نے زہر اگلنا شروع کیا اور کوئی بدتمیزی ان کے حق میں نہیں اٹھا رکھی۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنا تخلص یگانہ رکھا اور اپنا نسب نامہ چنگیز جہاں سوز سے ملا کر اپنے آپ کو فخر سے چنگیزی لکھنا بھی شروع کر دیا۔ سیہ بختی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب کئی سال سے برابر شتم رسول وطعن قرآن مجید کے ہذیان میں مبتلا ہے اور مسلمانوں کے دل وجگر پر مدت سے اپنے زہریلے تیر چلا رہا ہے۔ جنون کی حد یہ ہے کہ خط کی ابتدا

بسم اللہ کے جوڑ پر ان الفاظ سے کی ہے۔ ''بہ نام یگانہ جل جلالہ'' ......
فرعونِ بے سامان کی مثال اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے۔ بہر حال
خباثت وشیطنت کا یہ تازہ شاہکار کل مسلمان قوم کے سامنے حاضر ہے۔
جمیعۃ العلما اور سارے مسلم اخبارات خواہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں
اپنی ذمہ داری محسوس کریں۔ سوال نفس عقائد کا نہیں وہ کیسے ہی ہوں
برداشت کیے جا سکتے ہیں لیکن شرافت و ذلالت کے ڈانڈے بہر حال
الگ الگ ہیں اور شرافت کا یہ یکسر فقدان کوئی کیسے برداشت کرلے؟
خاص لکھنؤ میں شیعہ حضرات میرے علم میں ایک دو نہیں کثرت
سے ایسے ہیں جو عزت توحید واحترام ناموس رسول میں ہر گز کسی سے پیچھے
نہیں ہیں۔ مولانا سید علی نقی اور دوسرے علما و مجتہدین ہیں، شمس العلماء
مولوی مہدی حسین ہیں، راجہ احمد علی خاں والی سلیم پور ہیں، ڈاکٹر سید مجتبیٰ
کامون پوری ہیں، شیخ ممتاز حسین جونپوری ہیں، ایڈووکیٹ سید کلب
مصطفیٰ ہیں وغیرہم...... ایسے حضرات اگر آمادہ ہو جائیں تو ایسے بدزبان کو
سبق سکھا سکتے ہیں۔ شیعہ فرقہ سے مجھے کچھ زیادہ واقفیت نہیں لیکن اتنا
یقینی ہے کہ شتم رسول طعن قرآن پر طرح دیے جانے والے ان کے
علما ہرگز نہیں۔'' [1]

اسی بنا پر اہل محلّہ نے بھی ان سے نہایت برا سلوک کیا۔ مجبوراً یگانہ کو لکھنؤ کے اس مکان (سلطان بہادر روڈ، منصور نگر) کو خیر باد کہنا پڑا جس میں وہ سولہ برسوں سے قیام پذیر تھے۔ ان کا بیان ہے کہ وہ 2 رجولائی 1953 کو اپنا مکان مقفل کر کے چند ضروری سامان لے کر بیگم کے ہمراہ اپنے ہم زلف نثار حسین کے مکان (واقع شاہ گنج) میں منتقل ہو گئے۔ اس دربدری سے بھی ان کے مخالفین کو چین نہ ملا تو 12 رجولائی کو محلّہ والوں نے تالا توڑ کر یگانہ کے مکان پر قبضہ کرلیا۔ اس قضیہ کا المناک پہلو یہ تھا کہ اس کارروائی میں نہ صرف ان کا ساز وسامان لوٹ لیا گیا بلکہ اس کے ساتھ

---

1 بحوالہ سرفراز لکھنؤ 17 مارچ 1953

ساتھ یگانہ کی کتابیں اور مسوّدات بھی نیست و نابود ہو گئیں۔

ظاہر ہے اس واقعہ نے آگ میں گھی کا کام کیا اور اسے مذہبی رنگ دے کر پیش کیا گیا چہ جائیکہ اس قسم کی باتیں اسی دور کے کئی اور شعرا نے بھی کیں لیکن ان کی گرفت نہیں کی گئی، غالب، اقبال اور عزیز وغیرہ کے خلاف جو باتیں یگانہ نے کی تھیں ان کو بھی شعوری طور پر ابھارا گیا تاکہ علاقائی و دبستانی تعصب کو اور تقویت ملے جس کی یگانہ نے کبھی امید نہیں کی تھی ورنہ وہ اسے اپنا وطن ثانی کیوں کر بناتے۔ اس شہر نے مصحفی کی کیا درگت بنائی تھی سب جانتے ہیں۔ چند انتہا پسند عناصر کا مرزا یگانہ کے ساتھ یہ رویہ اختیار کرنا ناشائستگی کی تاریخ دہرانے کے مترادف ہے۔ گزشتہ برس شائع شدہ عابد سہیل کی خودنوشت ''جو یاد رہا'' میں بھی اس کے حوالے موجود ہیں جسے پڑھ کر رعشہ سا طاری ہو جاتا ہے کہ کسی شاعر و ادیب کے ساتھ ایسا برا سلوک بھی کیا جا سکتا ہے۔ خیر تاریخ گواہ ہے کہ شہر لکھنؤ میں ادبا و شعرا کے ساتھ کئی دفعہ اس قسم کے نازیبا رویہ اپنائے گئے تھے، اہل لکھنؤ سے میر ببر علی انیس بھی نالاں رہے ہیں جبھی تو مجبوراً انھوں نے بھی کہا تھا کہ۔

کوفہ سے مل رہے ہیں کسی شہر کے عدد
ڈرتا ہوں اے انیس کہیں لکھنؤ نہ ہو

لکھنؤ والوں کے اس سلوک سے ان کی خودستائی، خود بینی اور خود پرستی کو زک پہنچی اس میں شک نہیں۔ مرزا یگانہ کی مخالفت میں ان تمام عوامل نے اپنا اپنا حصہ ادا کیا اور پھر انھیں حیلہ سے ایک مشاعرے کی دعوت میں مدعو کر کے گدھے پر بٹھا دیا گیا، اور سر بازار جلوس کے ساتھ ایک گھنٹے تک گھمایا گیا[1] جلوس میں شامل لوگ انھیں گالیاں دیتے رہے، ان کے منہ پر تھوکتے رہے، منہ پر کالک پوتی گئی، جوتوں کے ہار سے نوازا گیا یعنی تمام طرح سے بے عزتی کی گئی، آخر کو مولوی گنج

1۔ کمال تو یہ ہے کہ وہ اس جلوس رسوائی کو فخریہ انداز میں بیان کرتے تھے کہ تاریخ ادب میں وہی ایسے شاعر ہیں جن کے ساتھ اس طرح بے ادبی کی گئی، ان کا جلوس رسوائی نکالا گیا۔ ان کا یہ دعویٰ اردو کے شعرا تک تو درست بھی ہے کیونکہ معروف عربی شاعر یزید بن مفرّغ کو بھی بصرے میں کتے، بلی اور سور کے ساتھ باندھ کر اس کا جلوس رسوائی نکالا گیا تھا جو اپنی طرح کا پہلا واقعہ تھا۔ یہ واقعہ ساٹھ سے چونسٹھ ہجری یعنی عہد ابن زیاد کا ہے، واضح رہے کہ یہ جلوس اسی کے حکم سے نکالا گیا تھا۔

کے علاقہ میں پولس کی کارروائی سے جان بچی۔اس صورت حال پر ان ہی کا ایک شعر جس کی صورت وہ آپ ہی تھے۔

زندان مصیبت سے کوئی نکلے تو کیوں کر
رسوا سر بازار ہوا بھی نہیں جاتا

یہ واقعہ 27 مارچ 1953 کو پیش آیا جب ان کی عمر تقریباً اڑسٹھ برس تھی۔ چہ جائیکہ انھوں نے ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ کی شان میں گستاخانہ انداز میں لکھے گئے کلام کے ازالے کی خاطر چھ بندوں پر مبنی ایک نعت بھی لکھی تھی لیکن وہ نعت کام نہ آسکی۔ وہ بھی عجیب آدمی تھے کہ وہ اس کلام کے لیے نادم نہ ہوئے اور نہ ہی معافی مانگی جو انھوں نے حضرت عمر اور جناب عائشہ کی شان میں گستاخانہ انداز میں لکھی تھیں۔نتیجتاً انھیں عام مسلمانوں کے غیض وغضب کا شکار ہونا پڑا۔ یہ وہ دور تھا جب ان کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے لیکن کمال تو یہ کہ ان کے بانکپن میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ یہ بے جگری کب کسی کے حصہ میں آتی ہے۔سچ تو یہ ہے کہ ان کی بے حرمتی کرنے والوں نے انھیں جسمانی طور پر جواذیتیں بھی دی ہوں مگر ان کے ضمیر کو مجروح نہ کر سکے۔ دیکھیں یہ شعر جس میں ان کی داستان حیات سمٹ کر رہ گئی ہے:

ٹھوکریں کھلوائیں کیا کیا پائے بے زنجیر نے
گردش تقدیر نے ،جولانی تدبیر نے

اس کٹھن دور میں انھیں کسی سے غم گساری ورفاقت کی امید نہ تھی ،سوائے اس شریک زندگی کے جسے وہ دل وجان سے چاہتے تھے۔جس کی محبت میں مرزا یگانہ چنگیزی زندگی بھر سرشار رہے اور جس کی مدح سرائی انھوں نے اپنی متعدد تحریروں میں کی ہے۔پیش ہے ایک اقتباس جس سے اس نکتہ پر روشنی پڑتی ہے:

''صدق وصفا،مہر ووفا کی دیوی (یگانہ بیگم) کو خداوند عالم نے جس کا رفیقِ زندگی بنا کر حقیقی مسرتوں سے بہرہ ور فرمایا،اس کی روحانی زندگی (مادّی کش مکش کے ہاتھوں) تلخ کیوں ہونے لگی؟ یہ صحیح ہے کہ مادّی کش مکش نے مجھے آزمائشوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔مگر اس کے ساتھ

ساتھ میری محترمہ شریک زندگی کی والہانہ محبت اور وفادارانہ دلجوئی نے
میرے دماغی توازن کو اتنا سنبھالے رکھا کہ میں سخت سے سخت امتحان میں
کامیاب رہا۔ یگانہ بیگم کے دم سے جو سچی روحانی مسرت مجھ ایسے بے نوا
کو حاصل ہے، وہ شاہوں کو تو کیا دنیا کے معدودے چند خوش نصیبوں ہی کو
مل سکتی ہے۔''[1]

وہ چاہتے تھے کہ ان کی بیگم پاکستان سے لکھنؤ واپس آجائیں۔ 4/اپریل 1953 کو وہ لکھنؤ واپس آئیں بھی لیکن وہ کب تک ان کا ساتھ دیتیں کہ وہ تو پاکستانی شہری تھیں۔ انھیں قیام ہند کی اجازت ایک محدود عرصے کے لیے ہی ملی تھی۔ ادھر یگانہ کی صحت مزید خراب ہوتی جارہی تھی دوسری جانب ان کی بیگم کا رویہ بھی تبدیل ہوتا جارہا تھا جو کہ ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنے بڑے بیٹے آغا جان کے نام 22/ستمبر 1955 کے خط میں کچھ یوں کیا ہے:

تمھاری اماں جان نے مجھے اتنا عاجز کیا کہ میں تنگ ہوکر پروفیسر مسعود
حسن صاحب کے باغ کے ایک حجرے میں آگے چھپّر ڈال کر ٹھہر گیا۔ 15/
جون (1955) کو...... آخر جولائی سے بارش کی شدت ہونے لگی۔ اور یہاں
طبیعت کا یہ حال کہ دو قدم چل نہیں سکتا۔ پیٹ میں سانس نہیں سماتی۔ گھڑی
گھڑی نڈھال ہوکر پلنگ پر کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔ ایک بڈھا نوکر مل گیا جو خبر
گیری کرتا تھا۔ مگر جب کھانے پینے کے لیے باہر چلا جاتا تھا تو پھر میں اکیلا رہ
جاتا، پھر خدا یاد آجاتا۔ آس پاس کوئی نہیں۔ جب حالت زیادہ خراب ہوگئی تو
پھر میں یہیں پہلے مکان میں واپس آگیا...... تمھاری اماں میری اس چند روزہ
زندگی سے اتنی بیزار ہیں کہ میرا ساتھ رہنا انھیں گوارا ہی نہیں۔ تم یہاں کیوں
آئے، میرے ٹھکانے پر کیوں آئے، جب جانتے تھے کہ میں یہاں رہتی ہوں
تو کیوں آئے...... میں شہنشاہ حسین وکیل کے مکان میں...... رہتا تھا، وہاں

---

1. یاس یگانہ چنگیزی: مغالطہ بحوالہ کلیات یگانہ: مرتبہ مشفق خواجہ صفحہ 332

سے دو بار مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی آئیں۔ خیر اب شہر میں سجاد حسین کی بیوی
کراچی جانے لگیں تو تمھاری اماں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں اور ہمیشہ کے لیے مجھے
تنہا چھوڑ گئیں...... اس سن میں ایسے مریض کو اس طرح مارنا چاہا کہ پانی دینے
والا بھی نہ ہو۔ بار بار فرماتی تھیں کہ اب مزہ مل جائے گا تنہائی کا۔ نہایت کرب و
ایذا میں ہوں۔"[1]

خدا جانے ایسے کیا حالات ہوئے جوان کی شریک حیات کا رویہ یکسر بدل گیا۔ یگانہ 15/جون سے 9/اگست 1955 تک پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے گھر "ادبستان" سے متصل ان کے مالی کے کوارٹر میں ہی رہے، جوان دنوں خالی تھا۔ چہ جائیکہ ادیب انھیں اپنے گھر میں ہی جگہ دینے پر آمادہ تھے لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا۔ اس امر کا اندازہ یگانہ کے اس خط سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے 9/ستمبر 1955 کو شعلہ کے نام لکھا تھا:

"پروفیسر مسعود حسن کے باغ میں چھپر ڈال کر ایک مہینہ چوبیس دن رہا مگر
برسات کا زور بندھا تو پھر میں زمین پر نہ تھا، آب و گل میں پڑا تھا اور مرض کی
شدت نے اور زیادہ پریشان کیا۔ آخر مجبور ہو کر 9/اگست کو پھر یہاں چلا آیا۔
کیا کہوں صبح سے شام اور شام سے صبح کیوں کر ہوتی ہے۔ دن میں کئی بار حالت
خراب ہو جاتی ہے۔ وہ تو چالیس برس کا ساتھ چھوڑ کر کراچی روانہ ہو گئیں......
دن کو خیر ایک آدھ آدمی خبر گیری کر لیتے ہیں مگر ہر وقت کون خبر لے۔ حالت
نازک ہوتی جا رہی ہے۔"[2]

بقول یگانہ اب ان کی حالت نازک سے نازک تر ہوتی
جا رہی ہے، ایسے میں انھوں نے اپنی تمام تر توانائی یکجا کر کے اپنے بیٹے
آغا جان کے نام ایک آخری خط 14 جنوری 1956 کو لکھ کر خدا حافظ!
کہہ ڈالا۔ دیکھیں چند سطروں پر مبنی یہ خط جو اپنے اندر مرزا یاس یگانہ

---

1 نقوش: خطوط نمبر (حصہ اول)، شمارہ 109 لاہور اپریل مئی 1968 صفحہ 255

2 مکتوب بنام دوارکا داس شعلہ، مورخہ 9 ستمبر 1955، تخلیقی ادب صفحہ 528

چنگیزی کی داستان حیات سموئے ہوئے ہے۔ ''جانِ پدر، سلامت رہو۔
پاؤں میں ورم آگیا گھٹنوں تک۔ موت کے سوا کوئی مسئلہ پیش نظر
نہیں ہے۔ خدا حافظ۔ یگانہ۔''[1]

اس خط میں یگانہ نے شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے تمام مسائل کا ذکر کر دیا ہے خواہ وہ بیماری ہو کہ تنہائی یا موت کا مسئلہ۔ ان کی تمام تخلیقات میں اس سے زیادہ افسردگی کہیں اور نظر نہیں آتی۔ اس جملہ میں انھوں نے ایک پیشن گوئی بھی کی ہے کہ اب زندگی کے دن بہت تھوڑے ہیں، اسی عالم میں وہ دن بھی آ گیا جب انھیں ان کے تمام مسائل کا حل مل جانا تھا۔ ان کی پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی اور مذکورہ خط لکھنے کے صرف بیس دن بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اس سے قبل پروردگار عالم کی بارگاہ میں انھوں نے اپنے ان گناہوں کے لیے توبہ بھی کی جوان سے جانے انجانے میں سرزد ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے حوالے سے دیکھیں یہ اقتباس:

''آخری رات آئی تو اس وقت یگانہ کے ساتھ تین حضرات تھے۔ یہ لوگ رات کو ٹھہرنا چاہتے تھے مگر یگانہ نے انھیں رخصت کر دیا۔ ہاں جانے سے پہلے ان کی موجودگی میں کلمہ پڑھ کر انھوں نے سوال کیا۔ میں مسلمان ہوں؟ میں شیعہ ہوں؟ جب ان تینوں حضرات نے اقرار کر لیا تب انھوں نے ان لوگوں کو رخصت کر دیا.... یگانہ کی تنہائی نے مرنے سے پہلے بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔''[2]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا والے خواہ انھیں کافر و ملحد اور نہ جانے کیا کیا کہتے رہے لیکن وہ اپنے مذہب پر قائم رہے، جسے وہ مذہب حق تصور کرتے تھے۔ مرزا یگانہ چنگیزی کی زندگی کے آخری ایام بڑی کسمپرسی میں گزرے کہ ان کے پاس نہ ان کے دوست و احباب تھے نہ ان کے بیٹے بیٹیاں تھیں اور نہ ہی ان کی شریک حیات اسی لیے تو اپنی زندگی کے آخری لمحات میں

1۔ مشفق خواجہ: کلیات یگانہ، اکادمی بازیافت، کراچی، پاکستان جنوری 2003 صفحہ 63

2۔ راہی معصوم رضا: یاس یگانہ چنگیزی، شاہین پبلشر، الہ آباد، صفحہ 65

اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے خود بھی کہا تھا کہ

''مرزا صاحب رہ گئے تنہا، اک اک ساتھی چھوٹ گیا''۔

یہ مصرع ان کی زندگی کا آخری مصرع بھی ہے اور ان کے کرب والم کا اعلامیہ بھی، یہاں اک اک ساتھی کے چھوٹنے کا غم اور تنہائی کی اذیت مرزا صاحب کی پسپائی کی طرف اشارہ تو ہے ہی، اسے دنیا سے بہ حسرت و یاس جدا ہونے کا اشاریہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیئے اسی پس منظر میں چند اشعار اور نقل کر دیے جائیں تو کہانی پوری ہو جائے گی کہ اس عالم آب و گل میں ان کے شب و روز کیسے گزرے۔ بقول مرزا یاس یگانہ چنگیزی۔

زندگی بھر تک تو شرمندہ نہ تھے یاروں سے ہم
لاش اٹھانے کا مگر آخر اک احساں رہ گیا

پھیلا کے پاؤں سوئیں گے تربت میں آج ہم
بس اب سفر تمام ہوا، گھر قریب ہے

ننگ محفل مرا زندہ مرا مردہ بھاری
کون اٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے

بہر حال زندگی اور موت کے درمیان انھوں نے خوب آنکھ مچولی کھیلی۔ وہ کبھی اپنے حریفوں پہ غالب آئے تو کبھی شکست اور ناکامی ان کا مقدر بنی۔ لیکن اس میں شمہ برابر بھی شک کا شائبہ نہیں کہ ان کے علم و فضل کے قائل ان کے سخت ترین بلکہ بدترین دشمن بھی تھے۔ وہ چاہتے تو اپنی صلاحیتوں سے نہ صرف خود فیضیاب ہو سکتے تھے بلکہ کئی نسلوں کو بھی فیضیاب کر سکتے تھے، ان میں دلوں پر اپنی عظمت کا سکہ جمانے کی اہلیت تھی اس کا اقرار عام طور پر کیا جاتا ہے لیکن ایسا نہ ہو سکا کہ اس میں ان کی ذہنی کجی کا بہت اہم رول رہا۔ اس کا اندازہ انھیں بھی تھا جبھی تو انھوں نے بہت پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ۔

تمہاری جیت تو جب تھی دلوں میں گھر کرتے
زباں سے ہار نہ مانیں گے ہارنے والے

مرزا یاس یگانہ چنگیزی کا یہ شعر ان کی اسی ذہنیت اور فکر کا غماز ہے، کہ ان کی علمیت اور قابلیت نے وہ کارنامہ انجام نہ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ بہر حال اتنی بات تو وہ تمام لوگوں پر ظاہر کر ہی گئے کہ وہ بھی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھے۔ زندگی کے ہر موڑ پر وہ اپنی روش پر قائم رہے کہ اسی میں ان کی فتح کا راز مضمر تھا۔

اسی عالم میں محلہ شاہ گنج لکھنؤ میں تقریباً بہتر برس کی عمر میں 4 فروری 1956 کو ان کا انتقال ہوا، اور وکٹوریہ گنج کی کربلائے منشی فضل حسین میں نہایت رازداری اور خاموشی کے ساتھ سپرد خاک کیے گئے، ایسا اس لیے کہ لکھنؤ کے چند لوگوں نے ان کو غسل نہ دینے کے لیے فتویٰ لے رکھا تھا اور وہ غسال کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ انھیں غسل نہ دے، لیکن ایک بار غسل شروع ہونے کے بعد اسے روکا نہ جاسکا کہ یہی انسانیت کا تقاضہ تھا۔ بقول پروفیسر شیخ انصار حسین (یگانہ ان کے خالو جان تھے) غسل کے بعد میت کی معیت کچھ یوں ہوئی:

> ''میت جب چلی تو میت لے جانے والوں اور نقیب کے علاوہ میرے والد، بنا ماموں...... فیروز عالم (بنا صاحب کا بیٹا)، رضی صاحب (ابا کے ایک دوست)، یگانہ خالو کا ایک خدمت گار، اسلم (بنا ماموں کا چھوٹا بیٹا)، کل چھ یا پھر کوئی ایک اور (مجھے نام نہیں یاد آرہا ہے) ساتھ تھے۔ ٹوریہ گنج چوراہے کے قریب پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب[1] نے بھی شرکت کی۔ وہ چند قدم جنازے کے ساتھ چلے اور اپنی کوٹھی واپس آگئے۔''[2]

افسوس صد افسوس کہ یگانہ جیسے ادیب وشاعر کے جنازے میں بہ مشکل تمام صرف بارہ افراد شامل ہو سکے تھے۔ جنھوں نے وقت آخر ان کے لیے دعائے خیر کی ہوگی۔ اس کا احساس

---

1 بارھویں شخص سید مسعود حسن رضوی ادیب تھے جو ان دنوں جلد کی کسی بیماری کے سبب نہ زیادہ چل پھر سکتے تھے نہ ہی جوتا، چپل وغیرہ پہن سکتے تھے، لیکن اپنی دیرینہ رفاقت سے مجبور ہو کر انھوں نے جنازہ کے ساتھ کچھ دور تک مرزا یگانہ کو کاندھا دیا تاکہ حق دوستی نبھایا جاسکے۔

2 پروفیسر شیخ انصار حسین ''مرزا یگانہ: یادیں اور ملاقاتیں'' بحوالہ۔ یگانہ (مرتبہ: ساحل احمد) صفحہ 369

شاید انھیں پہلے ہی ہو گیا تھا، ورنہ وہ اس قسم کے اشعار کیوں کر رقم کرتے کہ ۔

مزار یاس پہ کرتے ہیں شکر کے سجدے
دعائے خیر تو کیا اہل لکھنؤ کرتے

مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی قبر پر ان کی بیٹی مریم جہاں نے مسعود حسن رضوی ادیب صاحب کے مشورے سے ایک کتبہ نصب کرادیا تھا جس پر ان کی سنہ پیدائش 17 ر اکتوبر 1884 اور وفات 4 فروری 1956 درج ہے۔ ساتھ ہی ان کا یہ معرکتہ الآرا شعر بھی، جو کہ ان کا منشور زندگی تھا۔

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
آہ کس دن کے لئے ناحق پرستی کیجئے

یہ شعر آج بھی ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کراتا رہتا ہے کہ اردو ادب میں کوئی ایسا کج کلاہ شاعر بھی گزرا ہے جسے ناحق پرستی کبھی راس نہ آئی، جس نے حق پرستی کو ہی اپنا دین وایمان بنا رکھا تھا کہ اسی سے اس کی انا، خود آگاہی اور خود پرستی کو تقویت ملتی تھی جو کہ عین حق پرستی تھی۔

ادبی و تخلیقی سفر

اس میں کوئی شک نہیں کہ یگانہ کے حالات زندگی نے ان کے ادبی و تخلیقی سفر کو ہر موڑ پر مہمیز کیا ہے۔ نیز یہ بھی کہ ان کی تمام ادبی کاوشوں کے تار بھی ان کی زندگی کے کئی اہم واقعات سے ہی وابستہ ہیں۔ ورنہ ایک ایسا شخص جس کا خاندان چغتائیوں سے منسوب تھا میدان شعر و ادب میں اپنی شناخت ہرگز نہیں بنا پاتا۔ ان کے شجرۂ نسب سے یہ بات عیاں ہے کہ ان کے اسلاف صاحب سیف تو ضرور تھے صاحب قلم شاید کوئی نہ تھا۔ اس امر کے قیاس یوں بھی لگائے جا سکتے ہیں کہ جو شخص اس قدر بلند بانگ دعوے کرتا ہو وہ ان افراد کا تذکرہ کرنے سے کیوں کر چوکتا کہ اس کے خاندان میں بھی ادب و شعر کی گنگا بہتی تھی۔ بہر حال گھریلو ماحول ادبی نہیں ہونے کے باوجود بھی مرزا یگانہ فطری طور پر موزوں طبع واقع ہوئے تھے، شاید اسی بنا پر انھوں نے اسکول کے زمانے ہی سے شاعری شروع کر دی تھی اور اپنے استاد بیتاب سے مشورۂ سخن کر لیا کرتے تھے، انھی نے مرزا کو رموز فصاحت و بلاغت از بر کرائے تھے اس کا تو سراغ ملتا ہے لیکن انھوں نے کتنی مدت تک ان سے استفادہ کیا اس کا اندازہ نہیں کیونکہ بہت جلد ان کے استاد یعنی بیتاب نے انھیں شاد عظیم آبادی کے سپرد کر دیا تھا۔ اس طرح جلد ہی شاد نے بھی ان کی صلاحیتوں کا لوہا مان لیا اور چند غزلوں کی اصلاح کے بعد تو وہ لکھنؤ ہی چلے گئے۔ دیکھیں یہ اقتباس:

''کمترین یاس کو مولانا شاد مدظلہ کے تلمذ کا فخر حاصل ہے۔ مگر یہ

بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ اوّل اوّل شعر و سخن کی بسم اللہ خوانی جناب مولوی سید علی خاں صاحب بیتاب عظیم آبادی نے کرائی۔"[1]

انھیں میر تقی میر اور خواجہ حیدر علی آتش سے خصوصی شغف تھا جس کا ذکر انھوں نے بڑے ہی وثوق سے "خودنوشت یاس" میں بھی کچھ یوں کیا ہے:

"......... کچھ تو اپنی مذاق فطری کی بدولت اور کچھ حضرت شاد کی بموجب میر تقی میر اور خواجہ آتش علیہ الرحمۃ کے انداز تغزل کو اپنا نصب العین قرار دیا۔"[2]

مزاج کی سیمابیت، لاابالی پن اور دیگر کئی مجبوریوں نے انھیں عظیم آباد سے لکھنؤ کی طرف رجوع کرنے پر راغب کیا۔ بہر حال 1911 میں مرزا صاحب نے لکھنؤ کو وطن ثانی بنانے کا فیصلہ کر لیا، اور پھر پیارے صاحب رشید سے استفادہ کرنے لگے، مشاعروں میں ان کے کلام کی ایک دھوم سی مچ گئی۔ پاٹ دار آواز اور خصوصی لحن سے جب وہ کلام پیش کرتے تو معلوم ہوتا کہ کوئی تپا تپایا اور منجھا ہوا شاعر محو کلام ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ رہی ہو کہ انھوں نے اپنے متقدمین خصوصاً کلاسیکی شعرا کو دیکھا تھا، ان کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا، اور کئی مرتبہ تو انھوں نے ان کے کلام سے اثر انداز ہو کر ان ہی کے مصرعہ طرح پر غزلیں بھی کہی تھیں۔ شاید اسی لیے ان کا کلام پڑھتے وقت کئی مرتبہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں قدیم شعرا کا رنگ نمایاں ہے، ظاہر ہے استاد شعرا کی مصرعہ طرح پر جب غزلیں کہی جائیں گی تو کچھ تو اثر نظر آئے گا ہی۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انھوں نے ان مشاعروں کے لیے جو غزلیں کہی ہیں وہ پرانی لکیر پیٹنے جیسا ہے بلکہ میرے مطالعے کے مطابق ان تمام غزلوں میں بھی وہ عام طرز فکر سے بلند و بالا ہیں جسے ان کی ذہنی قوت اور فن کاری پر محمول کیا جانا چاہیے۔ یاس جب مستقل قیام کے لیے لکھنؤ آئے اس وقت ان کی عمر تقریباً چالیس برس ہونے کو تھی۔ ایسی عمر جبکہ ان کا رنگ سخن پختگی اختیار کر چکا تھا اور انھوں نے اپنی شاعری کا سکہ جمانا شروع کر دیا تھا۔ تلاش معاش کے علاوہ شاید یہ بھی ایک وجہ رہی

---

1. راہی معصوم رضا: یاس یگانہ چنگیزی، شاہین پبلشر، الٰہ آباد، صفحہ 3
2. یاس یگانہ چنگیزی: خودنوشت یاس (غیر مطبوعہ) صفحہ 2

ہو کہ وہ لکھنؤ کی ادبی صحبتوں میں خود کو ثابت کر سکیں کہ یہ کام انھوں نے بخوبی انجام دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عزیز اور صفی جیسے پختہ گو شعرا یہاں کی ادبی بساط پر چھائے ہوئے تھے، چہ جائیکہ ان کی شاعری پرانی روش پر استوار تھی جس میں نہ تازگی تھی نہ ہی کوئی نیا پن۔ ایسے میں یگانہ نئی اور انوکھی آواز بن کر ابھرنے لگے جس سے ان کے ہم عصروں کو یہ خوف ستانے لگا کہ کہیں ان کی بساط ہی نہ پلٹ جائے اور اسی بنا پر اس دبستان میں ان کے حریف و حلیف دونوں پیدا ہو گئے، ہاں حلیف تو ذرا کم کم ہی سامنے آتے تھے لیکن حریفوں نے تو کھلے بندوں ان سے نبرد آزمائی کی اور غالب کی طرفداری کا سہارا لے کر ان کا ناطقہ بند کر دیا۔ مرزا یگانہ چنگیزی کی آواز میں جو صلابت اور خود پرستی ہے اس کے ذمہ دار یہی عوامل ہیں۔ انھوں نے اپنے ادبی وتخلیقی سفر میں نہ جانے کتنے ہفت خواں طے کیے، لیکن یہ بات تو طے ہے کہ بہت سی چیزیں ابھی بھی پردۂ خفا میں ہیں۔ محققین ان کی تمام چیزوں کی تلاش وجستجو میں سرگرداں ہیں۔ امید ہے اس سے ''یگانہ فہمی'' کے نئے راستے ہموار ہوں گے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ یہیں پر یگانہ کی ان نگارشات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی سعی کی جائے جو عہد حاضر تک ادبی دنیا کا سرمایہ ہیں کہ یہ تمام تخلیقات ان کی عظمت وفن کاری کا منہ بولتا ثبوت بھی ہیں۔

(1) نشترِ یاس (مجموعہ کلام) نور المطابع لکھنؤ اپریل 1914: یاس یگانہ کا اولین مجموعہ کلام ہے۔ اس وقت تک یاس بقول خود ''دیوان خاک پائے آتش مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی تھے'' ہاں انھوں نے خود کو ساکن حال لکھنؤ جھوائی ٹولہ کا بتایا ہے۔ جو ان کے لکھنوی ہونے کی ابتدا بھی تھی کہ اس وقت تک ان کی شادی ایک لکھنوی خاتون سے ہو چکی تھی۔ اس مجموعہ کے سرورق پر ایک شعر تو درج ہے ہی اس پر حصہ اول بھی تحریر ہے جس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ کوئی دوسرا حصہ بھی زیر اہتمام ہے لیکن یہ حصہ کبھی شائع نہ ہو سکا۔ شعر ملاحظہ فرمائیں جس سے ان کی افتادِ طبع کا اندازہ ہو سکے گا۔

اثر پیدا کیا چاہو سخن میں طرز دلکش سے
تو انداز بیاں سیکھو انیس و میر و آتش سے

یہ مجموعہ سید نور الحسن مالک نور المطابع لکھنؤ تھوائی ٹولہ میں چھپا تھا جس میں تین غزلیں ابتدائی دور

شاعری کی بھی ہیں جن پر فکرِ قدیم درج ہے۔ان کے علاوہ اس مجموعہ میں ویسی غزلیں شامل ہیں جو طرحی مشاعروں کے لیے مختلف اساتذہ کی زمینوں پر کہی گئی تھیں۔

(2) چراغِ سخن: (رسالہ عروض وقوافی) مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ سے 1921 میں شائع ہوئی لیکن اس کا سنہ تصنیف 1914 ہے جو کہ ایک تاریخی نام بھی ہے۔ بقول یگانہ یہ ایک رسالہ عروض وقوافی ہے۔ جس میں علم عروض وقوافی کے نازک مسائل نہایت صاف زبان میں سلجھا کر بیان کیے گئے ہیں۔ ابتدا میں اہل زبان وزباں داں کا فرق اور صحیح مفہوم بتایا گیا ہے نیز ''ماہیت شاعری'' پر فلسفیانہ بحث کی گئی ہے۔ یہی وہ رسالہ ہے جس میں انھوں نے دو مضامین بعنوان شعر و سخن اور اہل زبان وزباں داں شامل کیے ہیں جن میں شعرائے لکھنؤ سے اپنے اختلافات کی بابت کھل کر عذر پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں حضرت ثاقب پر مضامین تو ہیں ہی مرزا غالب پر بھی چوٹیں کی گئی ہیں۔ اس کتاب کا مقصد یہ ثابت کرنا بھی تھا کہ عروض دانی میں ان کے حریف ان سے بہت پیچھے ہیں۔ اس تصنیف میں درج مضامین کی فہرست اس طرح ہے۔

(i) گلستان سعدی ونکات عروض

(ii) میاں ثاقب کی عروض دانی

(iii) میاں ثاقب کی حمایت

(iv) مذاق عروض

اس کے سرورق پر مصنف نے خود کو ''ابوالمعانی مرزا یاس عظیم آبادی لکھنوی'' لکھا ہے۔ جسے ان کے اندر پیدا شدہ ذہنی تبدیلی کا اشاریہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس مجموعہ کے سرورق پر ایک اہم شعر بھی درج ہے۔ جو ان کے حالِ دل کی ترجمانی کرتا ہے۔

مزار یاس پہ کرتے ہیں شکر کے سجدے
دعائے خیر تو کیا اہل لکھنؤ کرتے

(3) شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافات عزیز: یہ کتاب عزیز لکھنوی کی شاعری کی تنقید وتنقیص پر مشتمل ہے جس کا مطبع انوار پریس، علی گڑھ ہے۔ یہ کتاب 1925 میں شائع ہوئی۔ چہ جائیکہ یہ کتاب 1920 میں لکھی گئی اور 1923 میں پریس کے حوالے کی گئی لیکن اس پر سال طباعت

1925ہی درج ہے۔اس کتاب کے متعلق خود مرزا یگانہ کا قول ملاحظہ فرمائیں:

"......جس میں عزیز لکھنوی کی مصنوئی شاعری کی قلعی کھول کر محققانہ انداز سے داد تنقید دی گئی ہے۔مرزا غالب مصنف "قاطع برہان" کی ظریفانہ تنقیدوں سے جو لوگ واقف ہیں وہ مصنف رسالہ ہٰذا کی نقادانہ تلخ نوائیوں سے خاص لطف اٹھائیں گے۔دیباچہ میں مولوی غازی الدین بلخی نے مصنف کے مردانہ کیریکٹر اور گومتی والوں کی شرمناک سازشوں پر جو روشنی ڈالی ہے وہ تاریخی اعتبار سے اک گراں قدر خدمت ہے۔"

از قلم: مرزا یاس یگانہ لکھنوی عظیم آبادی

یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس میں انھوں نے خود کو پہلے لکھنوی لکھا ہے پھر بعد کو عظیم آبادی۔کتاب کے اختتام پر یہ باور کرایا گیا ہے کہ یہ تو پہلا حصہ ہے دوسرا حصہ بھی شائع ہونے کے امکانات ہیں۔چہ جائیکہ اس کتاب کا دوسرا حصہ کبھی شائع نہ ہو سکا۔لیکن اس سے یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ یاس کی یہ کتاب اہل لکھنؤ کے ساتھ ایک ادبی معرکہ کی بنا پر ہی معرض وجود میں آئی۔جس میں تنقید سے زیادہ تضحیک کا پہلو شامل تھا۔دیکھیں ایک نمونہ جس میں یگانہ نے عزیز کے ایک شعر۔

شوق اذان صبح میں بستر لگائے ہوں
کعبے کی چھت پہ سونے کا ساماں کئے ہوئے

پر کچھ یوں تبصرہ کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"اہاہاہا کعبے کی چھت پہ! کیا کیے ہوئے؟ سونے کا ساماں کیے ہوئے، بستر لگائے ہوں! واہ رے مصرع واہ، ترا کیا کہنا! کوئی نحوی غلطی ہو تو سمجھانے کی کوشش کی جائے۔دہقانی بد مذاقی، کوئی سمجھائے تو کیوں کر۔ذرا بلندئ تخیل تو دیکھئے۔میاں عزیز کو کعبے کی چھت پر سونے کا شوق چڑھ آیا ہے۔کسی بادشاہ نے ایک دفعہ کعبے کی چھت پر سے کشتی کا

قصد کیا تھا۔ آج لکھنوی تکیے نے وہیں معراج کی ٹھانی ہے۔ کسی حاجی سے پوچھنا چاہیے کہ کعبے کی چھت پر سونا چہ معنی دارد؟ کیا کوئی منطقی ایسے خردماغوں کو اس مصرعے کی لغویت ذہن نشین کرا سکتا ہے؟ نہ معلوم اس گومتی والے کے دماغ میں کہاں کا کوڑا ہوا ہے۔''[1]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ کہ اس کتاب میں عزیز کی شاعری پر محققانہ انداز سے داد تنقید دی گئی ہے، قطعی درست نہیں۔ یہ ان کے لہجے کا زور ہے جسے ان کی تنقید کا تادیبی انداز قرار دیا جانا چاہیے۔ ایسا اس لیے کہ ''شہرت کاذبہ'' پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کئی بار وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت طول دے گئے ہیں جس میں ذاتیات کو زیادہ دخل ہے، اس سے ان کی تنقیدی بصیرت مجروح ہوئی اس میں کوئی شک نہیں۔ بغور دیکھا جائے تو کلام عزیز پر ان کے تقریباً تمام اعتراضات بجا ہیں لیکن عزیز کی یہ شاعرانہ خامیاں ایسی بھی نہیں کہ ان کا شاعرانہ مرتبہ کم ہو سکے، جو کہ یگانہ کی اس تصنیف کا مقصد تھا۔

(4) غالب شکن (1934): دراصل اس کا شان نزول یگانہ کے ذریعہ لکھا گیا وہ مکتوب ہے جس کے مخاطب مسعود حسن رضوی ادیب ہیں۔ یہ ان کا ایسا طویل ترین خط ہے جو ''ترانہ'' کی اشاعت 1933 کے بعد لکھا گیا۔ اس مکتوب نے ایک کتابچہ کی شکل کب لے لی اس کا اندازہ ان کو بھی نہ ہو سکا۔ بہرحال اس میں یگانہ نے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے اس خط کا جواب دیا ہے جس میں ادیب صاحب نے ''ترانہ'' میں شامل ان مزاحیہ رباعیوں سے اجتناب برتنے کا مشورہ دیا تھا جس میں انھوں غالب سے متعلق طنزیہ و مزاحیہ بلکہ تمسخرانہ انداز اختیار کیا تھا۔ ادیب صاحب کا اعتراض تو دوستانہ تھا لیکن جب دیگر افراد کی طرف سے اعتراضات ہونے لگے تو ان کی انا پر بن آئی اور وہ بضد ہو گئے کہ اس میں کچھ بھی غلط نہیں۔ ان کی دانست میں غالب ایسے شاعر نہیں کہ ان کی خامیوں کی پردہ پوشی کی جائے۔ حالانکہ ''ترانہ'' میں تو ان کے خلاف صرف نو رباعیاں ہی تھیں، جبکہ ''غالب شکن'' میں ان کی تعداد چوبیس تک جا پہنچی۔ بقول مرزا یگانہ۔

''غالب شکن کی اشاعت کا ذمہ دار کون ہے۔ دلی والے ''ترانہ''

---

1. مرزا یگانہ: شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافات عزیز حصہ اوّل 1935 صفحہ 83

کی محض چند مزاحیہ رباعیوں سے چراغ پا ہو کر جب دلی وال نے رسالہ
ساقی دہلی کے اکیس صفحوں پر مہمل خامہ فرسائی کر کے ترانہ کو گویا مجموعہ
خرافات باور کرانا چاہا تو میں نے کہا، جاتا کہاں ہے اور لیتا جا۔ یہ ہے
غالب شکن کی شان نزول۔" [1]

اس اقتباس سے کوئی عامی بھی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ کارنامہ صرف ضد کی بدولت ہی ممکن ہو سکا تھا۔ ورنہ یگانہ بھی ایک حد تک مداح فن غالب تھے، انھیں ہندوستان کا مایہ ناز شاعر تصور کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی خوبیوں کی تقلید کی جائے۔ یہ کتاب تو بقول ان کے ان غلطیوں کی بہکی ہوئی ذہنیت پر چوٹ کرنے کے لیے لکھی گئی تھی جن کے دماغ میں فاسد مادہ جمع ہو گیا تھا اور جنھوں نے اساتذۂ ماضی و حال کا حق تلف کر کے غالب کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے، اگر اس پردائے دیلانہ مچائی جاتی یا اس پر سرے سے توجہ ہی نہ دی جاتی تو یہ سلسلہ رک جاتا لیکن یگانہ کے دشمنوں کو اسی حوالے سے انھیں زک دینے کا ایک بڑا موقع راس آیا تھا، وہ کب چوکنے والے تھے۔ ان لوگوں نے اسی آڑ میں چھپ چھپ کر خوب وار کیے اور نتیجتاً جب اس کے طبع ثانی کا مرحلہ آیا اس وقت تک حالات یکسر بدل گئے تھے۔ یعنی 1935 میں جب "غالب شکن" (دوآتشہ) کے نام سے آرمی پریس، دیال باغ، آگرہ سے طبع ہو کر منظر عام پر آیا تب تک یگانہ نے اس کتابچہ کو کتاب کی صورت دے دی تھی۔ یہی وہ موقع ہے جب انھوں نے پہلی بار اس پر اپنا نام "امام الغزل مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی علیہ السلام" لکھا ہے۔ بہر حال اب اس کی ضخامت بتیس صفحات سے بڑھ کر 80 صفحات ہو گئی اور رباعیوں کی تعداد بھی 24 سے بڑھ کر 32 تک جا پہنچی۔ اس کتاب کا مکتوب نما دیباچہ ان کی جرأت فکر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ کئی مقامات پر چیلنج کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ اب جبکہ "آیات وجدانی" اور "ترانہ" عالم شہود میں آ چکے ہیں غالب کے آسمانی صحیفہ کا بھرم کھلتا چلا جاتا ہے، نہایت معنی خیز بلکہ دعوت غور و فکر دینے والا ہے۔ وہ انہی جملوں پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اب چچا کو بھتیجے کے پیچھے پیچھے چلنا پڑے گا کہ برابر چلنے کا موقع بھی نہیں ہے۔ یہ ساری باتیں لکھنے کا

1۔ مرزا یگانہ: غالب شکن طبع دوم صفحہ 34

مقصد صرف غالب پرستوں کو زک پہنچانا تھا جو ان کے ''طرفدار'' تھے کیونکہ یگانہ خود بھی ''سخن فہم غالب'' تھے اس کا اعتراف انھوں نے اس مکتوب میں بھی کیا ہے، نیز یہ بھی کہ انھیں اعتراف تھا کہ جو لوگ گزر گئے ان کی خلقی کمزوریوں کو بکھانا کم ظرفی اور خباثت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی تنقید کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنے مرتبہ سے گر جائیں گے، بلکہ اس کا مقصد اس ادبی وقومی فریضہ کی ادیگی بھر ہے جو بحیثیت شاعران پر عائد ہوتی ہے۔ اس کتاب میں بھی انھوں نے سرورق پر یہ نام یگانہ اپنا وہی مشہور شعر درج کیا ہے جس سے ان کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ اپنی دانست میں اس شعر کے ذریعہ انھوں نے غالب پرستوں پر چوٹ بھی کی ہو تو بعید نہیں۔ ذرا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے اور غور کیجیے کہ اس ایک شعر کے ذریعہ کیا کچھ نہ کہہ دیا گیا ہے۔

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
آہ کس دن کے لئے نا حق پرستی کیجئے

اس کتاب کے انتساب میں انھوں نے اعصابی فتح حاصل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ میری نظر میں اسے بھی ان کا تادیبی انداز سخن قرار دیا جاسکتا ہے ورنہ انتساب کچھ یوں نہ ہوتا:

''تحفہ غالب شکن

بجناب ہیبت مآب، دیوتائے جلال وعتاب، پیغمبر قہر وعذاب، دشمن تہذیب پرفن، حق شناس، باطل شکن، مرد میدان گیر و بزن۔ شہنشاہ بنی آدم، سرتاج سکندر وجم حضرت چنگیز خاں اعظم قہر اللہ۔''

(5) ترانہ (مجموعہ رباعیات) اردو بک اسٹال، بیرون لوہاری دروازہ، لاہور ستمبر 1933: یہ ان کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جس میں ان کی 205 رباعیات شامل ہیں۔ جیبی سائز کے اس مجموعہ میں پندرہ رباعیاں فارسی میں ہیں تو آخری حصہ میں کچھ رباعیاں ''مزاحیہ'' کے عنوان سے درج کی گئی ہیں۔ بعد کے مجموعوں میں ان کو سنجیدہ کلام کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس مجموعہ میں انھوں نے ''مغالطہ'' کے عنوان سے ایک دیباچہ بھی تحریر کیا ہے جو ان کی ادبی ونجی زندگی سے متعلق کئی اہم معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ یہ مجموعہ کس قدر اہم ہے اس کا اندازہ معارف اعظم گڑھ کے اس تبصرے سے لگایا جاسکتا ہے جو 1934 میں شائع ہوا تھا:

''یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ مرزا یاس یگانہ اپنے
وقت کے ایک کامل شاعر ہیں۔ ان کے خیالات بلند، زبان صاف ستھری،
ترکیبیں چست اور کلام حشو زوائد سے پاک ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ لکھنؤ
کی شاعری میں ان کے ہنگاموں کے باعث مفید انقلاب پیدا ہوا''۔[1]

(6) آیات وجدانی (مجموعہ کلام): یہ ان کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جو پہلی دفعہ مع محاضرات مرزا مراد بیگ شیرازی اور حسب فرمائش شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ، لاہور کریمی پریس لاہور میں بہ اہتمام مرزا قدرت اللہ پرنٹر 1927 میں شائع ہوا۔ تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ مراد بیگ شیرازی ایک فرضی نام ہے جو کہ خود ان ہی کا وضع کردہ ہے۔ اور اس نام سے خود انھوں نے ہی خامہ فرسائی کی ہے۔ مجموعہ کے بیرونی سرورق پر ایک آیت یوں درج ہے۔ ''**انظرو الیٰ ما قال ولا تنظر الیٰ من قال** ''اور اندرونی سرورق پر سب سے پہلے یہ مصرع درج ہے ''جلوہ فرما حق ہوا باطل گیا''۔ ''آیات وجدانی'' کا طبع ثانی بہ اضافہ افکار جدید دی پرنٹنگ ورکس، دہلی سے 1934 میں شائع ہوا جو کہ مع اضافہ ہے اسے شرح کلام کا درجہ بھی حاصل ہے کہ اس میں کہیں کہیں اشعار کی شرح اور محاسن شعر بھی بیان کیے گئے ہیں۔ تا کہ اس کے در پردہ یگانہ کی مبالغہ آمیز تعریف کی جا سکے۔ اس مجموعہ میں چار مضامین بھی شامل ہیں۔ ان میں سے ایک ایک اقتباس یہاں بھی درج کیے جاتے ہیں تا کہ ان کا انداز نقد واضح ہو سکے:

(1) ادب خبیث: یہ اس مضمون کا عنوان ہے جس میں انھوں نے ترقی پسند ادب، خصوصاً ان شعرا کی تنقید کی ہے جو اس تحریک سے وابستہ ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اپنی تنقیدی شان دکھانے کی خاطر ایک مقام پر تو انھوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ ترقی پسندوں کے ہاتھوں فن شاعری ذلیل ہو رہا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ انھیں نئے ادب سے ہی نفرت ہے اور اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ ''ہت ترے نئے ادب کی ایسی تیسی''۔ دیکھیں یہ اقتباس جس سے ان کا نقطۂ نظر مزید واضح ہو سکے گا:

''نئے اسلوب کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو: بادِ صبا کے ہلکوروں میں تند

---

1 معارف 1934 صفحہ 314

ہوا تبدیل ہوئی / پھول کھلے (یہ گویا دوسرا مصرعہ ہے، تھو) / مستی چھائی (یہ گویا تیسرا مصرعہ ہے، تھو) / مرجھا گئے کنول شاداب ہوئے / میں ہوں بے دل / مایوس / ایک / بے چارہ۔ یہ سب گویا آٹھ مصرعے ہیں انھیں تلے اوپر لکھ کر ایک بند قرار دیا گیا ہے اور گویا ایک گاؤ دم سی شکل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ گویا شاعری کا اسلوب بدل رہا ہے! تھو...........

فیض احمد فیض: خدا جانے کون صاحب ہیں، مگر ''ترقی پسند'' ہیں۔ دیکھئے یوں ''شاعری'' فرماتے ہیں: بول کہ لب آزاد ہیں تیرے / بول زباں اب تک تیری ہے / بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے / بول کہ سچ زندہ ہے اب تک / بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے / بول بول بول ارے بول بول۔ جی ہاں یہ ہے گویا شاعری اور ترقی پسند شاعری نہ تال کی، نہ سم کی، نہ سر کی۔ دیکھئے خبردار اسے نثر نہ سمجھئے۔ یہی تو انقلابی شاعری ہے۔ اسی میں تو ملک کی ترقی کا راز پنہاں ہے۔ تھو!.....کیا واقعی یہ کوئی سنجیدہ فعل ہے یا تمسخر۔ کیا واقعی کوئی باحواس آدمی نیک نیتی کے ساتھ ان ٹوٹے پھوٹے بولوں کو سچ مچ شعر کی حیثیت سے پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ یہ تو ایسے اکھڑے اکھڑے بول ہیں کہ نثر کی حیثیت سے بھی کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ کیا کوئی نیچے درجے کا طالب علم اس قسم کے بولوں پر سو میں پانچ نمبر بھی پا سکتا ہے؟ کیا ان میں پھوہڑ پن کے سوا کوئی ادبی سلیقہ پایا جاتا ہے۔''[1]

(2) دختران حوا کا کورس: اسے جوش کی نظم پر یگانہ کی تنقید کا ایک نمونہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ دیکھیں یہ اقتباس جس میں یگانہ نے ان سے متعلق کچھ ملے جلے خیالات پیش کیے ہیں:

''میں آج سے بہت پہلے کسی موقع پر کہہ چکا ہوں کہ جوش کا کلام پرکھنے کے قابل ہئی (ہے ہی) نہیں۔ محض الفاظ کی بے معنی نمائش ہوتی

---

1. میرزا یگانہ ادب خبیث

ہے،مگر میں نے ان کی بچی باغیانہ شاعری کے خلاف کبھی ایسا حکم نہیں لگایا۔ مذہب، معاشرت اور سیاست کے خلاف جوش کی باغیانہ نظمیں ان کی شاعرانہ قابلیت اور قومی خدمت کا روشن ثبوت ہیں۔ البتہ شعر وادب کو آرٹ کی حیثیت سے اور ہندوستان کی نسوانی عظمت کو اخلاقی حیثیت سے ان کی نظم بازیوں نے بڑا نقصان پہنچایا۔ جو قابل افسوس ہے، لکھنؤ کی رعایت لفظی کم از کم الفاظ کا ایک کھیل تو تھی۔ کچھ نہ کچھ معنوی تعلق کی خاطر رعایت لفظی کا کھیل کھیلا جاتا تھا، اور وہ کھیل ایک کھلاڑی کا ہوتا تھا، اناڑی کا پھوہڑ پن نہ تھا۔ مگر جوش کے ہاں وہ کھیل بھی نہیں ہوتا، بے ضرورت ٹھونس ٹھانس ہوتی ہے، محض نمائش کے لیے، وہ بھی بے ہنری کے ساتھ۔''1

(3) زیٹ زپٹ: اس مضمون میں بھی جوش ملیح آبادی کی شاعری پر تنقید کی گئی ہے۔ دیکھیں اس سے ایک اقتباس:

''جوش کی عادت ہے کہ وہ شاندار بھاری بھرکم نفیس الفاظ معنی و مفہوم میں اضافے کے لیے نہیں محض دکھاوے کے لیے استعمال کیا کرتے ہیں۔ جنھیں عبارت سے کوئی معنوی تعلق نہیں ہوتا۔''2

(4) مکتوب بنام فراق: اس میں مرزا یگانہ نے نہ صرف جگر مرادآبادی کے دیوان میں شامل ان کے دیباچہ پر تنقید کی ہے، جس میں جگر نے لکھا تھا کہ ان کی شاعری اور زندگی میں مطابقت ہے کوئی تضاد نہیں۔ یگانہ چنگیزی نے اسی حوالے سے ان کی زندگی سے متعلق بھی نہایت چبھتے ہوئے خیالات پیش کیے ہیں اور انھیں لاابالی، مطلق العنان اور غیر ذمہ دار وغیرہ قرار دے دیا ہے جو کہ ایک تنقید نگار کا منصب نہیں۔

یقین ہے مندرجہ بالا اقتباسات سے قارئین کو یگانہ کے طرز تنقید کا احساس ہو گیا ہوگا۔

---

1 مرزا یگانہ: دختران حوا کا کورس

2 مرزا یگانہ: زیٹ زپٹ

واضح رہے کہ اس مجموعہ میں پہلی مرتبہ انھوں نے سرورق پر بنام یگانہ ایک شعر بھی درج کیا ہے جس سے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شعر کچھ یوں ہے کہ۔

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
آہ کس دن کے لئے نا حق پرستی کیجئے

اس مجموعہ میں انھوں نے اپنے نام کے آگے ''امام الغزل'' کا اضافہ تو کیا ہی اس میں خود کو عظیم آبادی بھی نہیں لکھا یعنی اب وہ پوری طرح لکھنوی ہو گئے۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو اسی میں یہ اعلان بھی ملتا ہے کہ وہ حیدرآباد، دکن میں سب رجسٹرار کے عہدے پر فائز ہیں۔ پیش ہے ماہنامہ ''ساقی'' میں شائع شدہ تبصرے کا ایک اقتباس جو ''آیات وجدانی'' کے دوسرے ایڈیشن پر کیا گیا تھا:

''مرزا صاحب بہت عمدہ شعر کہتے ہیں۔ خصوصاً غزل گوئی میں ان کا رتبہ بہت بلند ہے''[1]

(7) گنجینہ (انتخاب کلام) قومی دارالاشاعت، لاہور (وائی ایم سی اے بلڈنگ، دی مال، لاہور) سے شائع ہوا تھا جس پر پرنٹ لائن کچھ اس طرح درج ہے۔ ''کوآپریٹیو کیپیٹل پرنٹنگ پریس وطن بلڈنگ لاہور میں چھپی اور محمد کلیم اللہ پرنٹر و پبلشر نے پروگریسیو بک کلب، لاہور سے شائع کیا''۔ اس مجموعہ میں ان کی غزلیں اور رباعیات سبھی کچھ شامل ہے۔ اسے ان کے قیام ممبئی کا ثمرہ کہا جانا چاہیے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب وہ آل انڈیا ریڈیو کے روح رواں ذوالفقار علی بخاری کے یہاں قیام پذیر تھے۔ اور وہیں پر انھوں نے اسے ترتیب دے کر ترقی پسند تحریک کے بانی سجاد ظہیر کو دیا تھا کہ وہ اس کی اشاعت کا انتظام کریں۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی کے اشاعتی ادارے کی جانب سے یہ کام بحسن وخوبی کیا جاتا تھا۔ قیاس اغلب ہے کہ یہ مجموعہ جوش کے مجموعہ ''رامش ورنگ'' (1945) کے بعد شائع ہوا ہو یعنی 1946 کے آخر میں یا 1947 کے اوائل میں۔ اس کے بعد تو قطعی نہیں کہ اگست میں ہمیں آزادی مل گئی تھی اور ہندوپاک کا قیام عمل میں آگیا تھا۔

(8) خودنوشت: اس کا مخطوطہ سید احمد زیدی جھنجھانوی، رائے بریلی کے کتب خانے میں محفوظ

---

1 ''ساقی'': اکتوبر 1934 صفحہ 142

ہے۔راہی معصوم رضا نے اپنی تصنیف ''یاس یگانہ چنگیزی'' میں اس کے متعلق یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ اسے آل احمد سرور کی خدمت میں بھی پیش کیا گیا تھا۔یہ خودنوشت 74 فل اسکیپ صفحات پر محیط ہے جسے یگانہ نے 1917 میں لکھنا شروع کیا تھا۔اس خودنوشت کے علاوہ ان کی کئی بیاضیں بھی ہیں جن میں کجکول (در تحویل سید احمد صغیر زیدی جھنجھانوی،رائے بریلی) تو108 صفحات پر محیط ہے۔لیکن یگانہ کے یہ سبھی رشحات قلم ہنوز منظر پر آنے کے منتظر ہیں۔ان چیزوں کے علاوہ ان کا ارادہ ایک بیاض تیار کرنے کا بھی تھا جیسا کہ ان کے متقدمین تذکروں کی شکل میں ترتیب دے گئے تھے۔اس کے لیے انھوں نے جولائی 1916 میں اس عہد کے تمام شعرا سے اپیل کی تھی اور اخبارات کے ذریعہ اشتہار بھی شائع کرائے تھے کہ شعرا ایک فل اسکیپ کاغذ کے سرے پر اپنی تاریخ وسنہ پیدائش،ولدیت اور سکونت وغیرہ لکھ کر جس قدر ممکن ہو جلد از جلد روانہ فرمائیں۔ان کی یہ اپیل کہ منتخب اشعار فقط ایک صفحہ پر ہی ہوں اور اپنے دست خاص سے لکھ کر راونہ کیے جائیں تاکہ یہ کام مکمل ہو سکے ان کی تنقیدی بصیرت کا غماز ہے۔اس اشتہار کے لیے انھوں نے ایک سوا کتیس شعرا کی فہرست بھی مرتب کی تھی جن میں وہ شعرا بھی تھے جن کو یگانہ کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے مثلاً صفی،عزیز،ثاقب اور محشر وغیرہ۔اس فہرست سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں پہلی بات تو یہ کہ اس زمانے میں کون کون سے شعرا اہمیت کے حامل تھے نیز یہ بھی کہ یگانہ ادب کے معاملے میں دیانتداری کے قائل تھے نہ کہ جانبداری کے۔افسوس کہ ان سبھی چیزوں کو وہ خود پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا پائے کہ یہ سبھی چیزیں مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی شخصیت اور ان کے ادبی مقام کے تعین میں ایک اہم ادبی حوالہ ثابت ہوتیں۔

یاس یگانہ چنگیزی کے ادبی وتخلیقی سفر میں صحافت کا بھی اہم رہا حصہ ہے کہ انھوں نے ابتدا اسی سے روزی روٹی حاصل کی۔وہ برسوں اودھ اخبار سے وابستہ رہے اور پھر ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب انھوں نے صحافت کے میدان میں بھی خود قسمت آزمائی کی اور کوشش کی کہ اپنا رسالہ جاری کیا جائے کہ اس سے ان کی ادبی حیثیت کے تعین میں مدد ملے نیز کچھ مالی منفعت بھی ہو جائے۔ان کی اس سعی نامراد میں ماہنامہ ''کار امروز'' لکھنؤ جنوری 1921 کے پانچ شمارے اور ماہنامہ ''صحیفہ'' اٹاوہ جنوری 1925 کے ایک شمارے کا اجرا اہمیت کا حامل ہے۔جیسا کہ ذکر کیا

جا چکا کہ یہ رسالے اپنی طبعی عمر سے پہلے ہی راہیٔ ملک عدم ہو گئے لیکن ان کی اس کوشش کو اہم قرار دیا جانا چاہیے۔ یاس یگانہ چنگیزی نے یوں تو نہ جانے کتنے مضامین اور خطوط تحریر کیے ہوں گے لیکن افسوس کہ وہ سبھی دست بردِ زمانہ سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ جو کچھ چیزیں دستیاب ہو سکی ہیں وہ سب اہم ضرور ہیں کہ اس سے ان کی ذات والا صفات پر روشنی پڑتی ہے۔ ادبی دنیا کو ان کے جو اہم رشحاتِ قلم فراہم ہو سکے ہیں ان کی فہرست کچھ یوں بنتی ہے۔

(i) کھلی چٹھی مطبوعہ ساقی دہلی، مارچ 1934

(ii) کھلی چٹھی مطبوعہ ساقی دہلی، جون 1934

(iii) آرٹ اور مذہب، نیرنگ خیال فروری 1952

(iv) بابر اور فتح پنجاب، عالمگیر، (لاہور) اکتوبر 1927

(v) لکھنؤ سے للہی عالمگیر (لاہور) مارچ 1946

یہ امر مبنی بر حقیقت ہے کہ ابتدا میں تو شعرائے لکھنؤ کے ساتھ یگانہ کے تعلقات بہت حد تک خوش گوار تھے یہاں تک کہ وہ عزیز، صفی، ثاقب و محشر وغیرہ کے ساتھ نہ صرف مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے، بلکہ اس سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ انھیں دبستان لکھنؤ میں خود کو ممتاز و ممیز ثابت کرنے کی ایک دھن تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ ان پر یہ منکشف ہوتا چلا گیا کہ لکھنؤ والے کسی بیرونی کو اس کا جائز مقام دینے سے کتراتے ہیں چہ جائیکہ وہ خود کو اس عہد کے تمام شعرا سے اعلیٰ، افضل و برتر سمجھتے تھے۔ ''نشتر یاس'' کے حوالے سے ''ماہیت شاعری'' کا یہ اقتباس دیکھیں جس میں وہ کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> ''ابن خلدون کہتا ہے کہ ''ایک عجمی فصحائے عرب کے کلام کی ممارست سے اہل زبان میں شمار کرنے کے لائق ہو سکتا ہے'' لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ یاس کو (جس کی زبان مادری اردو ہے جس کی زندگی ہمیشہ سے فصحا اور شعرائے باکمال کی صحبت میں گزری ہے۔ اساتذہ کے کلام جس کے پیش نظر ہیں جس کو لکھنؤ کے اساتذۂ عصر کی صحبت کا شرف حاصل ہے۔ خاندان انیس و دبیر و تعشق اور دیگر خاندانی شعرائے باکمال جس کے

کلام کو اساتذۂ سابق کا صحیح نمونہ مانیں، جس کا کلام قادرالکلامی اور زبان
دانی کے جوہر خود دکھاتا ہو) لکھنؤ اہل زبان نہ مانے۔ جب خاندانی
شعرا اور اہل زبان نے مان لیا تو معاصرین حال اور آئندہ نسلوں پر فرض
ہے کہ یاس کی زبان اور اجتہادی تصرفات سے سند لیں۔"[1]

"نشتر یاس" کا یہ اقتباس لائق توجہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی، بلکہ مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ وہ اگر صرف اپنے اہل زبان ہونے کا دعویٰ کرتے تو کوئی توجہ ہی کیوں کر کرتا۔ لیکن جب اسی
رو میں وہ لکھنؤ والوں کو کھری کھوٹی سنانے لگے تب بات بگڑ گئی۔ دیکھیں "نشتر یاس" کا یہ حصہ جس
میں بڑے ہی نپے تلے انداز میں لکھنؤ والوں کو نافہم، غاصب اور ذلیل گردانا گیا ہے۔

"آج کئی دن ہوئے کہ مسٹر ربیندر ناتھ ٹیگور کو کلکتے میں بادشاہ
سویڈن کی طرف سے ان کی ادبی خدمات کے صلے میں طلائی تمغہ عطا
ہوا۔ لیکن لکھنؤ کے اکثر نافہم دوسروں کے حقوق کو نہایت بے دردی سے
پامال کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اہل انصاف کی نگاہوں میں خود ذلیل
ہوتے ہیں۔ یورپ کو دیکھئے کہ ایک ہندستانی شاعر کی قدر کس آزادی سے
کی ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔"[2]

ان کا یہ اصرار کس قدر بجا تھا یہ تو بحث طلب ہے لیکن 1914 میں جب ان کا مجموعہ
کلام "نشتر یاس" شائع ہوا تو اس پر واویلا مچ گیا کہ اس پر لکھنؤ کے کئی اہم شعرا نے ان کی تعریف و
توصیف میں نہایت عمدہ تقریظیں لکھی تھیں۔ ان میں محمد جعفر اوج خلف ارشد مرزا دبیر، جناب محمد
عارف نبیرۂ میر نفیس، جناب نواب سید بہادر حسین خان انجم یادگار امیر، جناب سید محمد کاظم
جاوید خلف امید وغیرہم کے نام نامی شامل تھے۔ ان تقریظوں نے ان کے خلاف عجب قسم کا
معاندانہ ماحول بنا دیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے صفی، عزیز، ثاقب، محشر اور آرزو کے ساتھ ساتھ دیگر
شعرائے لکھنؤ ان کی مخالفت پر اتر آئے، ظریف لکھنوی نے تو ان کے خلاف ہجویہ نظمیں تک لکھ
ڈالیں اور اسے لکھنؤ کے بازاروں میں تقسیم کرا دیا۔ لیکن اس سے یگانہ کے اعتماد میں کوئی کمی نہ آئی

1. مرزا واجد حسین یاس: نشتر یاس صفحہ: ح
2. مرزا واجد حسین یاس: نشتر یاس صفحہ: ح

اور وہ مزید طنطنے کے ساتھ لکھنؤ والوں پر چوٹ کرنے لگے۔ چہ جائیکہ وہ لکھنؤ سے فیضیاب ہوئے تھے اور اس کے معترف بھی تھے لیکن ان کے پاس شاید اس کے علاوہ کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔ کلیات یگانہ کے مرتب مشفق خواجہ کے حوالے سے ملاحظہ فرمائیں چند تقریظیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بادمخالف میں بھی لکھنؤ کے کئی اہل قلم ان کی شاعرانہ عظمت کے قائل تھے۔ ان زعمائے ادب کے رشحات قلم مرزا یگانہ کے لیے بھی ایک سند کی حیثیت رکھتے تھے جس کا انھوں نے بڑے ہی شدو مد کے ساتھ ذکر بھی کیا ہے۔

جناب نواب انجم صاحب مدظلہ، یادگار اسیر مرحوم

عالی جناب مرزا واجد حسین صاحب یاس دام مکارمہم کا کلام جلالت تخئیل، لطف زبان اور تمام شاعرانہ خوبیوں کے اعتبار سے حضرت آتش کے کلام سے بالکل ملتا ہے۔ بے شک اس رنگ کو خوب فرماتے ہیں۔ ایسے زبردست مصرع لگانے والے بہت کم دیکھے۔ لکھنؤ میں ان کا دم غنیمت ہے۔

سیّد بہادر حسین خان انجم لکھنوی

حضرت اوج مدظلہ، خلف ارشد حضرت دبیر اعلی اللہ مقامہ

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ شانہ، اللھم صل علی محمد وآلہ الطاہرین۔

طائر فکر کی بلند پروازی، قوۃ متخیلہ کی سخن سازی ہر وہبی شاعر میں پائی جاسکتی ہے۔ مگر جن باریکیوں کو اور نزاکتوں کو عام لوگ دقیق و پیچیدہ طریق سے ادا کرتے ہیں، خاص اہل زباں انہی خیالات کو اپنے روزمرہ میں نہایت صفائی سے باندھ دیتے ہیں۔ پیش پا افتادہ مضامین کو اگر اور لوگ محض سادہ و سُست لفظوں میں لاتے ہیں تو اہل زبان ان ہی باتوں کو پاکیزہ اور نرالے انداز سے ادا کرتے ہیں۔ انھیں محاورات کی برجستگی، تازگی، شوخی اور صرف بامحل کی وجہ سے اہل زبان کو غیر اہل زبان پر شرف امتیاز حاصل ہے۔ ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر میں کہتا ہوں کہ عزیز باتمیز

مرزا واجد حسین صاحب سلمہ اللہ الواہب متخلص بہ یاس محاورات اردو پر
پوری مہارت رکھتے ہیں۔ دو مصرعوں میں مطالب کثیر کو بمحاورت محاورت
اردو اس حسن سے ادا کرتے ہیں جو اہل زبان و قادر الکلام کا حق ہے۔
شستہ رفتہ زبان میں نزاکت معنوی پیدا کرنا، تخیل میں تازگی وجدت سے
کام لینا، حشو و زوائد سے بچنا اور ان کی جگہ معنی خیز ٹکڑے رکھنا اور ان سب
باتوں کے ساتھ ابتذال و تعقیب و تعقید سے محفوظ رہنا، یہی وہ جوہر ہیں
جن کی وجہ سے گرچہ موصوف کا کلام لکھنؤ میں ایک خاص درجے پر فائز
ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا یاس سلمہ نے جناب خواجہ آتش مغفور
کے رنگ تغزل کو پھر سے تازہ کیا ہے۔ ان کے کلام میں بھی وہی عبرت
خیز، نشاط انگیز، حسرت آمیز مضامین ہیں، وہی سوز و گداز، وہی حسن تخیل،
وہی طرز بیان، وہی بانکپن، وہی آمد ہے۔ حق یہ ہے کہ ان کے اشعار میں
آتش مغفور کا سوز و ساز پایا جاتا ہے۔ عزیز موصوف شرفائے عظیم آبادی
سے تلمذ رکھتے ہیں۔ اب اک (ایک) رح عرصے سے لکھنؤ میں مقیم ہیں۔
حق سبحانہ و تعالیٰ انھیں خوش رکھے اور ان کی عمر میں برکت دے فقط۔

کتبہ اقل الخلیقہ بل لاشئی فی الحقیقہ
محمد جعفر اوج عفی عنہ
23 ربیع الثانی 1332ھ عید نوروز

حضرت جاوید مدظلہ، خلف ارشد حضرت اُمید مرحوم

میں نے کلام بلاغت نظام مرزا واجد حسین صاحب یاس کو دیکھا
اور سنا۔ فی الواقع جناب موصوف کا کلام حضرت آتش کے کلام سے اس
قدر ملتا ہے کہ تختۂ قرطاس سے عشق و محبت کے شرر اڑتے ہوئے نظر آتے
ہیں۔ بے شک اس رنگ کو خوب فرماتے ہیں۔ ایک ایک نقطہ روکش مہر
تاباں ہے اور ایک ایک حرف برق معانی کی جلوہ گاہ۔ اجتہادی و استنباطی

خوبیاں، آتش بیانی و زبان دانی کے کرشمے جو جان شاعری سمجھے جاتے
ہیں، آپ کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔

راقم آثم
سید محمد کاظم جاوید

حضرت رشید مدظلہ العالی نبیرۂ میر انیس اعلیٰ اللہ مقامہ
سبحان اللہ، کیا کہنا ہے۔ جناب مرزا واجد حسین صاحب یاس دام
مجدہم کا کلام آتش مرحوم سے بہت ملتا ہے۔ بے شک اس رنگ کو خوب
فرماتے ہیں۔

ہیچمدان رشید عفی عنہ
ہیچمداں حمید عفی عنہ

ان تقریظوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی یگانہ کی عظمت کا بھرپور اعتراف کیا گیا تھا لیکن مخالفین نے ان حضرات پر ہی اعتراض کر ڈالا جو ان کے مداح اور ہمنوا بن رہے تھے۔ بہر حال مرزا کی پذیرائی میں کوئی آڑے آئے یہ ان سے کب برداشت ہوتا اور یوں بھی وہ ایک ایسا ذہن لے کر پیدا ہوئے تھے جس میں چوکنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ انھوں نے بھی اپنے مخالفین کا ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کیا، حد تو تب ہو گئی جب انھوں نے ایک رسالہ ''چراغ سخن'' لکھ کر شعرائے لکھنؤ کی سخن دانی کی سخت ترین گرفت کی۔ چونکہ شعرائے لکھنؤ غالب کے مقلّد تھے، اس لیے یگانہ کے لیے لازم ٹھہرا کہ وہ غالب کی ایسی پرزور مخالفت کریں کہ یہ بت ٹوٹے اور ان کا بھرم قائم ہو سکے۔ شعرائے لکھنؤ کے مقابلے پر انھوں نے اپنے آپ کو ''آتش کا مقلّد'' کہنا شروع کر دیا۔ ''نشتر یاس'' (1914) کے سرورق پر انھوں نے اپنے نام سے پہلے ''خاک پائے آتش'' لکھا اور جب سال بھر بعد ''چراغ سخن'' شائع ہوئی تو اپنے آپ کو ''آتش پرست'' کے درجے تک پہنچا دیا۔ اس کا ثبوت ''شہرت کاذبہ'' میں بھی نظر آتا ہے۔ بقول

یاس:

''کجا یاس آتش پرست اور کجا تقلید غالب''[1]

غالب شکنی کا آغاز ''نشتر یاس'' سے ہوتا ہے۔ جس میں انھوں نے یہ لکھا:

''مختصر سا دیوان بھی ہزاروں پیچیدگیوں اور خامیوں سے بھرا پڑا ہے۔''[2]

''چراغ سخن'' میں مخالفت کی یہ لے مزید تیز ہوگئی، پھر انھوں نے رسالہ ''خیال'' ہاپوڑ (بابت نومبر 1915) میں ''آتش و غالب'' کے عنوان سے غالب کے خلاف پہلا باقاعدہ مضمون لکھا۔ اور پھر یہ سلسلہ ایک طویل عرصے تک جاری رہا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ کسی بھی موضوع پر لکھتے، تان غالب پر ٹوٹتی۔ 1927 میں جب ''آیات وجدانی'' کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں بھی جا بجا غالب پر اعتراض کیے گئے تھے۔ یہ سلسلہ اس حد تک بڑھا کہ انھوں نے اپنے ہم زاد مرزا امراد بیگ شیرازی کی زبان سے یہ اعلان بھی کروا دیا کہ:

''اب دیوانِ غالب میزان انصاف و خرد میں کلام یاس کے برابر نہیں تل سکتا۔''[3]

اس سلسلے کی انتہا وہ رسالہ تھا جو ''غالب شکن'' کے نام سے پہلی مرتبہ 1934 میں اور اضافوں کے ساتھ دوسری مرتبہ 1935 میں شائع ہوا۔ یگانہ نے ایک طویل عرصہ غالب اور شعرائے لکھنؤ کی مخالفت میں لکھنے میں صرف کیا۔ چہ جائیکہ ان کے کئی معروضات مبنی بر حقیقت تھے لیکن اس سے ان کے خلاف فضا سازگار ہوتی چلی گئی اور ان کے حریفوں کو اچھا موقع مل گیا۔ مقام افسوس ہے کہ انھوں نے ایسا کیوں کر کیا کہ اس فعل سے غالب اور شعرائے لکھنؤ کو تو کوئی نقصان نہ پہنچا، لیکن یگانہ کو بہت نقصان اٹھانا پڑا نیز یہ بھی کہ وہ اپنی شاعری پر ویسی توجہ نہیں مرکوز کر سکے جو کہ حق تھا، میرے خیال میں اگر وہ اس روش پر قائم نہیں رہتے تو انھیں وقت کے ساتھ ساتھ شہرت و عزت بھی کچھ نصیب ہو جاتی۔ بقول مرزا یگانہ چنگیزی ؎

---

1. یاس: شہرت کا ذبہ صفحہ 36
2. یاس یگانہ: نشتر یاس، صفحہ ک
3. یاس یگانہ چنگیزی: آیات وجدانی 1927

بہار لکھنؤ کو خون دل سے کس نے سینچا ہے
خدا لگتی بھی کہہ دے گا کوئی پتہ زباں ہو کر

بہر حال یہ ایک الگ موضوع ہوسکتا ہے کہ ایسا کر کے انھوں نے کیا کھویا کیا پایا لیکن ایسے میں بھی وہ شعرائے معاصر خصوصاً معیار پارٹی سے جھگڑے کی بنا پر لکھنؤ میں ادبی سطح پر الگ تھلگ زندگی نہیں بسر کر رہے تھے بلکہ اس دور میں بھی وہاں کے متعدد اہم ادبا وشعرا سے ان کے خوش گوار مراسم تھے۔ جس کا ثبوت کچھ یوں بہم پہنچتا ہے کہ جب 1919 میں انھوں نے ''انجمن خاصان ادب'' کے نام سے ایک ادبی انجمن بنائی تو اس کے ہموا اس دور کے اہم شاعر و ادیب بھی تھے۔ انجمن کے صدر سید محمد احمد بیخود موہانی تھے، سکریٹری خود یگانہ چنگیزی اور جوائنٹ سکریٹری عبدالباری آسی۔ اس کے سرپرستوں، اراکین اعزازی اور اراکین خصوصی میں فصاحت لکھنوی اور سیّد مسعود حسن رضوی ادیب جیسے لکھنوی اہل قلم شامل تھے۔ انجمن کے اغراض و مقاصد کے بارے میں خود انھوں نے رسالہ ''مخزن'' لاہور کے جولائی 1919 کے شمارے میں ایک مختصر مضمون لکھا تھا۔ لیکن جب تک یہ انجمن قائم رہی اس انجمن کی سرگرمیاں مشاعرے کے انعقاد سے کچھ زیادہ نہیں تھیں۔ اس کا اندازہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے نام روانہ کیے گئے خط کے اس اقتباس سے بھی ہوتا ہے۔

> ''انجمن خاصان ادب کی مختصر روداد یہ ہے کہ میری، یاس اور امید وغیرہ کی رائے سے ایک انجمن قائم کی گئی، جس کی مختصر روداد اور نامکمل دستور العمل ہمدم، پیسہ اخبار، اودھ اخبار میں شائع ہوا۔۔۔اس انجمن کا صدر، جب تک کوئی بڑا اچھا اور بہی خواہ شخص نہ ملے، بیخود ناشاد ہے اور سکریٹری مرزا یاس عظیم آبادی ہیں۔ دستور العمل کی نقل چھپ جانے پر ابلاغ خدمت ہوگی۔ آپ کا نام محض اپنے وثوق پر میں نے آپ سے پوچھے بغیر داخل کر دیا ہے۔ اس انجمن نے اب تک تین ماہانہ مشاعروں کے سوا کچھ نہیں کیا...... مختصراً اس کے مقاصد یہ ہیں ؛ قابل مگر گمنام شاعروں اور اہل قلم کو روشناس خلق کرانا مجلس تنقید قائم کرنا جس میں وہ

منتخب افراد ہوں گے جو انجمن کو میسر آ سکیں۔اردو، فارسی، عربی غزل (کذا) کے تصانیف پر تبصرہ وتنقید لکھنا، سررشتۂ تعلیم کی کتابوں کے متعلق اظہار رائے کرنا۔ تصنیف وتالیف وترجمہ سے اردو کی خدمت، ماہانہ رسالہ کا اجرا وغیرہ وغیرہ......انجمن خاصان ادب کے دفتر کا پتہ: لکھنؤ قاضی کا باغ مرزا واجد حسین صاحب یاس عظیم آبادی سکریٹری انجمن خاصان ادب۔

مورخہ 3 ستمبر 1919 "[1]

اس خط کے مطابق جولائی سے ستمبر 1919 تک اس کے تین ماہانہ مشاعرے ہی منعقد ہوئے تھے ابھی اس انجمن نے بہت زیادہ ادبی سرگرمیاں نہیں دکھائی تھیں۔خط سے انجمن کے قیام کا مقصد تو واضح ہے لیکن اس کے در پردہ مشاعروں سے مرزا یگانہ چنگیزی کا بائیکاٹ کیا جانا اور لکھنوی شعرا سے بیخود موہانی کی کشیدگی بھی ہو تو بعید نہیں۔کشیدگی کی وجہ عزیز لکھنوی کے خلاف ایک مشاعرے میں پڑھا گیا یہ شعر تھا۔

ناکامیوں میں گزری، بدنامیوں میں گزری
عمر عزیز گزری سب خامیوں میں گزری

چہ جائیکہ بیخود نے اس کے لیے اخلاقاً معذرت طلب کی تھی لیکن اس شعر نے کینہ پروری کے بیج بو دیے تھے اور عزیز اور ان کے ہم نوا ان سے بھی احتراز برتنے لگے تھے۔اس پس منظر میں دیکھا جائے تو "انجمن خاصان ادب" کے ساتھ ساتھ مرزا یگانہ اور بیخود موہانی کی نزدیکیاں بھی تحقیق کا موضوع بن سکتی ہیں۔

مرزا یگانہ نے بھی کیا خوب طبیعت پائی تھی۔انھیں نہ صرف اہل زبان ہونے پر اصرار تھا بلکہ اس پر بھی کہ اسی رو سے ہی انھیں لکھنوی سمجھا جائے۔یہی وجہ ہے کہ پہلے وہ اپنے نام کے ساتھ صرف "عظیم آبادی" لکھا کرتے تھے، بعد کو لکھنوی لکھنے لگے۔جس کا ثبوت (آیات وجدانی، طبع اوّل کے سرورق پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ "میرزا یگانہ لکھنوی" ہی لکھا ہے)۔اہل

1۔ "خطوطِ بیخود" مرتبہ سیّد زائر حسین کاظمی، لکھنؤ 1977، صفحہ 49-48

زبان ہونے کی وجہ سے یا لکھنؤ میں ایک طویل عرصے تک قیام کے بعد انھیں لکھنوی کہلانے کا حق حاصل ہو گیا تھا یا نہیں، مگر ان کا عظیم آبادی ہونے سے انکار کرنا، ایک سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ عظیم آبادی سے لکھنوی ہونے تک کی تگ و دو اور اس قسم کی جرأت بھی ایک ذہنی کجی کا غماز ہے۔ جس کا اظہار انھوں نے 18-1917ء ہی میں کر دیا تھا جب وہ اپنی خود نوشت سپرد قلم کر رہے تھے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''جن لوگوں کو مجھ سے بات چیت کا اتفاق ہوا ہے، وہ کیا فرما سکتے ہیں کہ میرے لب و لہجہ اور میری گفتگو میں اور اہل زبان کی بول چال میں کوئی فرق ہے۔ آج تیرہ برس سے لکھنؤ میں رہتا ہوں اور میرے ساتھ عظیم آباد کا کوئی شخص بھی لکھنؤ نہیں آیا۔ مجھے تو جن لوگوں سے معاشرت ہے، وہ یا تو میرے اعزہ ہیں جو شرفائے لکھنؤ میں سے ہیں یا میرے احباب جو شعرائے لکھنؤ میں ہیں۔ مجھے تو اب عظیم آباد کا کوئی محاورہ بھی یاد نہیں رہا۔''[1]

اپنے وطن عظیم آباد کی زبان اور وہاں کے محاورات سے اظہار برأت ایک عجیب قسم کی ذہنی کیفیت کی غمازی کرتا ہے۔ میرے خیال میں انھیں دبستان عظیم آباد کی آب و ہوا میں پرورش پانے اور اس کی نمائندہ خصوصیات کا نقیب و امین ہونے پر فخر ہونا چاہیے تھا۔

یوں بھی اہل زبان ہونے کے لیے کسی شخص کا کسی خاص خطہ سے تعلق رکھنا ہرگز معنی نہیں رکھتا کیونکہ ہر شاعر و ادیب کی قدر و قیمت اس کے ادبی سرمایہ کی بنا پر ہوتی ہے۔ مرزا یگانہ کے اندر پنپ رہی احساس کمتری نے ان کی ذہنیت کو جس نہج پر ڈال دیا تھا۔ اسی نے شعرائے لکھنؤ کو ان کی مخالفت پر اکسایا۔ اسی ردعمل نے پہلے تو یگانہ کو ''عظیم آبادی'' سے ''لکھنوی'' بنایا، پھر معاملہ تخلص تک پہنچا کہ پہلے وہ ''یاس'' تھے، پھر ''یاس یگانہ'' ہوئے اور آخر میں صرف ''یگانہ'' رہ گئے۔ بقول مرزا امراد بیگ شیرازی:

''پہلے یاس تخلص کرتے تھے مگر بعد میں شعرائے لکھنؤ کی لاگ یگانہ تخلص کرنے کا باعث ہوئی۔''[2]

1۔ یاس یگانہ چنگیزی: خود نوشت یاس: قلمی صفحہ 4 2۔ دیباچہ: آیات وجدانی طبع اول صفحہ 6

مرزا امراد بیگ شیرازی کا یہ کہنا کہ 1920 میں یگانہ نے مشہور ''قطعۂ فخریہ'' لکھ کر عظیم آباد کے ایک مشاعرے میں پڑھا تھا اور جب وہ وہاں سے واپس لکھنؤ آئے تو روزنامہ اخبار ''ہمدم'' میں شائع کرادیا۔

یگانہ کے اس شعر کا عظیم آبادیوں پر تو کوئی اثر نہ ہوا لیکن اس سے شعرائے لکھنؤ کا چراغ پا ہونا فطری معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یگانہ نے اپنے ایک شعر سے دو دو چوٹیں کی تھیں۔

لکھنؤ کے فیض سے دو دو ہیں سہرے میرے سر
اک تو استاد یگانہ دوسرے داماد ہوں

یاس کے ساتھ یگانہ تخلص کرنے کی بنیاد یہیں سے پڑی، یاس کے ساتھ یگانہ کا اضافہ شاید اسی ردعمل کا نتیجہ تھا، مختلف ادوار کے کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت دنوں تک دونوں ہی تخلص بیک وقت استعمال کرتے رہے۔ اور جنوری 1925 میں جب مارہرہ سے رسالہ ''صحیفہ'' شائع ہوا تو اس پر ''یاس یگانہ لکھنوی عظیم آبادی'' درج کیا گیا تھا۔ یہ سلسلہ ''آیات وجدانی'' کے طبع اوّل یعنی 1927 تک جاری رہا بعد میں یاس تخلص بالکل ترک کردیا۔ بلکہ ایک مرتبہ منوہن تلخ کے نام تحریر کردہ ایک خط میں انھیں یاس لکھنے سے منع بھی کیا۔ اس افتادِ طبع کا تجزیہ بھی کیا جانا چاہیے کہ وہ کون سے عوامل تھے جس نے انھیں اس قسم کا رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

ذرا غور سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ مرزا یگانہ چنگیزی کو اپنے نام کے ساتھ طرح طرح کے سابقے اور لاحقے استعمال کرنے کا جنون سا تھا۔ اس کا ثبوت کچھ یوں مل جاتا ہے کہ کبھی وہ ''امام الغزل'' بن جاتے تو کبھی ''جل جلالہ''، کبھی ''خداوندِ معانی'' تو کبھی ''ابوالمعانی'' وغیرہ۔ انھوں نے کئی بار خود کو ''کم ترین'' اور ''خاک پائے آتش'' لکھا تو کئی مرتبہ وہ ''مجاہد العصر''، ''غالب جنگ''، ''ابوالاعلیٰ اور ''یگانہ علیہ السلام'' تک بن گئے لیکن ''ابوالمعانی'' اور ''امام الغزل'' ان کے پسندیدہ القابات تھے۔

تاریخی شواہد کی بنا پر یہ ثابت ہے کہ وہ 1923 میں ''ابوالمعانی'' بن گئے تھے جب رسالہ ''صلائے عام'' دہلی کے اپریل 1923 کے شمارے میں ان کا ایک مراسلہ شائع ہوا تھا۔ اسی

طرح ''غالب شکن'' کی دونوں اشاعتوں میں ان کے نام سے پہلے ''امام الغزل'' لکھا ہوا ملتا ہے۔ 1951 میں بھی جب انھوں نے ''گنجینہ'' (قلمی) کا مسودہ تیار کیا تو اس کے سرورق پر اپنے قلم سے اپنے نام سے قبل یہی لقب لکھا تھا۔ اس مسودے میں شامل ایک غزل کا مقطع بھی اس جانب اشارہ کرتا ہے جو بہت مشہور ہوا۔

یگانہ بنے یا امام الغزل
وہ جو کچھ بنے، بنتے بنتے بنے

ان کے نام کے ساتھ ''چنگیزی'' کا اضافہ پہلی مرتبہ 1932 میں کہے گئے کلام میں نظر آتا ہے۔ اور پھر 1933 میں جب ''ترانہ'' اشاعت کے مرحلے سے گزر کر سامنے آیا تب اس کے سرورق پر وہ نہ صرف ''چنگیزی'' بن کر سامنے آئے بلکہ اسی مجموعہ میں وہ چنگیزی کی وجہ تسمیہ بھی واضح کر گئے۔ انھوں نے ''ترانہ'' کا انتساب چنگیز خاں کے نام کیا ہے جسے یگانہ ''پیغمبر قہر و عذاب'' اور ''شہنشاہ بنی آدم'' سمجھتے تھے۔

دراصل چنگیز خاں سے عقیدت اور وابستگی کا یہ اظہار انھوں نے اپنے حریفوں کو دہلانے کے لیے ایک حربہ کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اس سلسلے میں یگانہ کا یہ دلچسپ قول پیش نظر رہے جس سے ان کی فہم وفراست کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''جس طرح چنگیز نے اپنی تلوار سے دنیا کا صفایا کر دیا تھا، اسی طرح جب سے میں نے غالب پرستوں کا صفایا کرنے کا تہیہ کیا ہے، یہ لقب اختیار کرلیا ہے۔''[1]

اس سے قبل بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ یگانہ لکھنؤ اور مضافات لکھنؤ کے علاوہ دوسرے شہروں کے مشاعروں میں بھی کثرت سے شرکت کرتے تھے۔ مشاعروں سے دلچسپی کی وجہ سے بعض اوقات وہ دور دراز کے سفر پر بھی آمادہ ہو جاتے۔ ان کا یہ رویہ ''نشتر یاس'' اور ''آیات وجدانی'' (طبع اوّل) کی غزلوں کے وقیع ترین سرمائے کو منصۂ شہود پر لانے میں خاصا معاون ثابت ہوا کہ ان مجموعوں میں مشاعروں کی طرحوں پر مبنی کلام خصوصیت کے ساتھ شامل ہے۔

---

1. حیات جاوداں (سوانح عمری ماسٹر الطاف حسین) از احمد حسین مارہروی، کراچی صفحہ 268

اگر ان کے ادبی وتخلیقی سفر پر نگاہ مرکوز کی جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ مشاعروں سے قطع نظر رسائل بھی ان کے منظور نظر تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کا کلام نیز مضامین وغیرہ انھی رسالوں کے توسط سے منظر عام پر آتے رہیں۔ اسی لیے انھوں نے برصغیر ہند و پاک کے مختلف شہروں سے نکلنے والے رسائل سے مستقل رابطہ قائم کر رکھا تھا، یہ فیض انھیں قیام لاہور کے سبب ہی سے حاصل ہوا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں بعض رسائل تو ایسے بھی تھے جن کے تقریباً ہر شمارے میں ان کے رشحات قلم شامل ہوتے ان میں ''نظارہ'' میرٹھ اور رسالہ ''جادو'' ہاپوڑ و میرٹھ جیسے رسالے نہایت اہم تھے۔

انھیں شاعری کے ساتھ ساتھ مضمون نگاری کا شوق بھی تھا اس امر کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ مرزا یگانہ نے علمی و ادبی موضوعات پر اچھی خاصی تعداد میں مضامین تو لکھے ہی ہیں انھوں نے انگریزی کی بعض تحریروں کو ترجمہ کے مراحل سے گزار کر اردو میں بھی منتقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی انشائیہ نما تحریریں بھی خاصی تعداد میں ملتی ہیں جس میں ایک منفرد یگانہ چنگیزی ہمارے سامنے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ان سبھی چیزوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا قلم خوب رواں تھا۔ ہو نہ ہو یہ ان کے اولین ذریعہ معاش صحافت کا کرشمہ ہو۔

بہر حال اسی روانی قلم نے ان کی مشکل گھڑی میں ان کا ساتھ دیا۔ انھوں نے اپنے دشمنوں کو جواب دینے کے لیے اپنے نام سے تو لکھا ہی، کئی مرتبہ وہ یہ کام فرضی ناموں سے بھی کیا کرتے جس کے لیے انھوں نے کئی نام تراش رکھے تھے۔ تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ مرزا مراد بیگ شیرازی انھی میں سے ایک اہم نام ہے جس کا ذکر اس تصنیف میں بھی مختلف حوالوں سے کئی مرتبہ آ چکا ہے۔

یہاں ان فرضی ناموں یا ان فرضی تحریروں سے کوئی بحث نہیں کی جا رہی ہے، دیکھیں یگانہ کے قلم سے انھی کا تحریر کردہ ایک اقتباس جسے انھوں نے ''مغالطہ'' کے عنوان سے ادبی دنیا کے سپرد کیا تھا۔ گزارش یہ ہے کہ اس اقتباس کو گذشتہ مباحث کے پس منظر میں ملاحظہ فرمایا جائے کہ اس سے بھی یگانہ کے ادبی وتخلیقی سفر کی کئی گرہیں کھلتی ہیں:

''میرے نظریۂ زندگی کی نسبت عام طور پر لوگ اس مغالطے میں

پڑے ہوئے ہیں کہ زندگی کے تلخ تجربات نے میرے نظریۂ حیات میں (خدانخواستہ) ایسی افسردگی پیدا کر دی ہے جس سے میری طبیعت ہر وقت مکدر رہتی ہے۔ مگر یہ قیاس حقیقت حال سے بعید ہے۔ پست ہمتوں کا ذکر نہیں، مردوں کے لیے تو زندگی کے تلخ تجربے کڑوی دوا کا حکم رکھتے ہیں جو اصلاح مزاج کے لیے اک ضروری چیز ہے۔

طبیعت کا مکدر رہنا اور نظریۂ حیات میں افسردگی پیدا کرنا تو کجا، یہی تلخی و ترشی تزکیۂ نفس کا آلہ بن کر انسان کو سچی مسرتوں سے شادکام بناتی ہے۔ مسرتیں بھی وہ جو نجاستوں سے پاک و صاف ہوتی ہیں۔ مگر پاک اور ناپاک مسرتوں میں فرق کرنا بھی ہر اک (ایک) کا کام نہیں ہے۔ قدرت کے خزانے سے جسے ایسی پاک و پاکیزہ مسرت نصیب ہو وہ زندگی سے بیزار کیوں ہونے لگا۔ اس کے نظریۂ حیات پر افسردگی کیوں چھانے لگی؟ زندگی کے تلخ تجربوں سے دوچار ہونا اور بات ہے اور زندگی سے بیزار ہو جانا اور بات ہے۔ میں کبھی زندگی سے بیزار نہیں ہوا۔ ہاں دل جب تک زندہ ہے زمانے کے سرد و گرم سے متاثر ہونا اک قدرتی امر ہے مگر اس کے لیے یہ لازم نہیں کہ تلخ تجربات سے نظریۂ حیات میں بھی تلخی پیدا ہو جائے اور انسان زندگی جیسی نعمت سے آزردہ ہو جائے۔ دل اک ترازو ہے جس کے پلّے ہوا کے جھونکوں سے آن کے آن ادھر ادھر جھک تو جاتے ہیں مگر پھر تھوڑی دیر میں توازن برابر ہو جاتا ہے۔"[1]

اس اقتباس میں انھوں نے اپنے نظریۂ حیات پر جس قدر بے باکی سے روشنی ڈالی ہے، اسے لائق توجہ گردانا جانا چاہیے۔ ان کا کہنا کہ زندگی کے تلخ تجربات سے ان میں کوئی افسردگی نہیں آئی ہے، یا یہ کہ وہ ان تلخ تجربوں کو کڑوی دوا سمجھتے ہیں جو ان کی اصلاح کے کام آئے ہیں کہاں تک بجا و درست ہیں اس کا فیصلہ ایک عام قاری بھی کر سکتا ہے۔ لیکن ان کا یہ کہنا کہ تلخی و ترشی تزکیۂ نفس کا آلہ بن کر انسان کو سچی مسرتوں سے شادکام بناتی ہے، سچائی پر مبنی ہے۔

---

1. مرزا یاس یگانہ: مغالطہ مشمولہ "ترانہ" صفحہ 2

افسوس کہ ایسا ان کی زندگی میں نہ ہوسکا کہ تلخی و ترشی ان کی شاعری و زندگی دونوں ہی پر حاوی رہیں، چہ جائیکہ ان کے مخصوص لب و لہجے کو، ان کے اچھوتے انداز بیان کو جس میں تیکھا پن اور کرارا پن نمایاں ہے اہمیت کی حامل ہے۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شاید اسی سے ان کی شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ ملتا ہے۔ اور شاید اسی بنا پر ان کی شاعری کو، اردو شاعری کی منفرد آواز بھی قرار دیا گیا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ تمام عمر دشواریوں سے نبرد آزما رہتے ہوئے بھی زندگی کرتے رہے۔ اس حوصلہ کو کیا نام دیا جائے کہ وہ لمحہ بھر کو بھی زندگی سے بیزار نظر نہیں آئے۔ ان کے دوستوں، دشمنوں اور عزیز و اقارب سبھی نے بارہا اس بات کا اقرار کیا ہے کہ وہ ہمیشہ اور ہر حال میں ثابت قدم رہے۔ ایسا اس لیے بھی تھا کہ ان کی نظر میں انسان کو زندگی جیسی عظیم نعمت سے آزردہ ہونے کا حق نہیں ہے۔

میرے خیال میں نہ صرف اس قول کا بلکہ "ترانہ" میں درج چند صفحات پر مبنی اس پورے شاہکار کا جسے انھوں نے "مغالطہ" کے عنوان سے پیش کیا ہے، نفسیاتی سطح پر بھی تجزیہ ہونا چاہیے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ چند صفحات پر مبنی ان کا یہ اشاریہ ان کی زندگی، شخصیت اور ان کی ادبی حیثیت کو جاننے سمجھنے اور پرکھنے میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ ہو نہ ہو ایسے میں ایک منفرد یاس یگانہ چنگیزی ہمارے سامنے آسکے، جو دنیائے شعر و ادب میں ویسا قابل احترام بن جائے جیسا کہ اپنے زمانے میں ہرگز نہ تھا۔

یگانہ فہمی: ایک تنقیدی محاکمہ

گذشتہ اوراق میں ہم نے مرزا یگانہ کی شخصیت اور ان کے ادبی و تخلیقی سفر نیز تصنیفات و تالیفات پر روشنی ڈالنے کی سعی کی تھی، تا کہ ان کے متعلق ایک عمومی رجحان قائم ہو سکے۔ میرے خیال میں یہیں پر یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ ان کی شاعری پر تنقید کرنے سے قبل، ''یگانہ فہمی'' کی نئی راہیں متعین کرتے وقت ہمارا ذہن نہایت صاف ہونا چاہیے کہ ہم ''غالب شکن'' اور ''شہرت کاذبہ'' یا ''چراغ سخن'' کے مصنف سے متعلق کوئی رائے قائم کرنے نہیں جا رہے ہیں بلکہ ایک ایسے شاعر کے کارناموں کو جانچنے پرکھنے کی سعی کر رہے ہیں جس نے ہمیں ''آیات وجدانی''، ''نشتر یاس'' اور ''ترانہ'' و ''گنجینہ'' جیسے شہپارے دیے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ان چیزوں سے صرف نظر کیا جائے گا جن کا شمار ان کی بدنام زمانہ تخلیقات میں ہوتا ہے۔ ایسا اس لیے کہ یہ سبھی چیزیں ان کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

اس ضمن میں ان سبھی تخلیقات و تصنیفات کے حوالے ضرور آئیں گے کہ اس کے بغیر انصاف ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اگر ناقدین یگانہ کی مانیں تو ہم ایک ایسے شاعر کی بازیافت کا عمل انجام دینے جا رہے ہیں جس کی شاعری کو اس کی ذات والا صفات کا عکس کہا گیا ہے۔ مجھے یہ انداز نقد کچھ یوں بہتر محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس پس منظر میں ان کی شاعرانہ انفرادیت کا جائزہ لیا جائے گا تبھی شاید ایک اہم شاعر کے ساتھ انصاف ہو سکے گا۔ میرا ایقان ہے کہ اسی نقطۂ نظر سے ہمیں یہ

بھی معلوم ہو سکے گا کہ یگانہ میدان شعر و ادب میں واقعی یگانہ تھے یا نہیں۔ بقول یگانہ ؎

ہیں خاک برابر مگر اکسیر ہیں ہم
غالب کے پیر ثانی میر ہیں ہم
دنیائے ادب تھی منتظر مدت سے
معلوم ہے کس خواب کی تعبیر ہیں ہم

مرزا یگانہ کی اس بلند آہنگی کو کیا نام دیا جائے...... کہ انھوں خود کو خاک برابر کہہ کہ بات شروع کی لیکن اسی رو میں اپنے آپ کو "اکسیر" بھی قرار دے گئے جو کہ ان کی زندگی اور شاعری کا مطالعہ کرنے پر خال خال ہی نظر آتا ہے۔ یہاں خود کو غالب کے پیر کی صورت پیش کرنا یا پھر ثانی میر ہونے کی بات، یہ سب دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یا شاعرانہ تعلّی۔ ہیرالڈ بلوم کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اسے ہم (Anxiety of Influence) یعنی اثر انداز ہونے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہونا بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک رمز ضرور پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ ان کے یہاں ان دو شعرا کی طرح توانائی، خود اعتمادی اور رجائیت کا دور دورہ پایا جاتا ہے۔ ان کے اس بیان میں ایک عجیب قسم کی انا بھی جھلکتی ہے جو شاید ان کے جینے کا سہارا تھی۔ اگر یگانہ کے کلام کو بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے کلام میں پرواز تخیل کا اہم مقام تو ہے ہی انھیں حقائق کو من و عن پیش کر دینے بلکہ اس کی بے لاگ ترجمانی کا فن بھی آتا ہے، جس میں ان کے لب و لہجہ کی کاٹ اور دانشمندانہ بغاوت کے عناصر اہم کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ شاید یہ وجوہات بھی رہی ہوں کہ ان کی ویسی قدر نہیں کی گئی جیسا کہ حق تھا کہ دنیا تو ہمیشہ سے ہی لگی لپٹی باتوں کی عادی رہی ہے۔ اس میں یہ حوصلہ ہوتا ہی نہیں کہ وہ ایک باغی کی کھری کھری سنے خواہ وہ دنیائے ادب کا باغی ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ شاگردیٔ بیتاب و شاد کے دور سے ہی ان کا ذہن بلند پروازی کا ثبوت دے رہا تھا کہ شاد نے بھی اسی لیے انھیں چند غزلوں کی اصلاح کے بعد ہی فرصت دے دی یا انھیں مزید سبق کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ لکھنؤ پہنچنے کے بعد بھی ان کے ذاتی جوہر کی وہ قدر نہ کی گئی جس کی امید میں وہ یہاں آئے تھے۔ بلکہ چند مہینوں بعد ہی ان کی دیگر شعرائے لکھنؤ سے مخاصمت ہوگئی اور یہی تلخی بڑھتے بڑھتے ذاتی پرخاش کی

حد تک جا پہنچی اور پھر وہ دبستان شعر و ادب کی عالیشان نگری میں تنہا رہ گئے۔ بلکہ یوں کہیں کہ اسی نے انھیں متشدد بنا دیا، اور ان کی شاعری میں جو گھن گرج اور شاعرانہ فن کاری تھی سب کی سب ان کی ذہنی کیفیات کے سبب مفقود ہوتی چلی گئیں اور ان کا صرف ایک ہی مقصد بچا رہ گیا اور وہ یہ کہ اس ''احساس زیاں'' کو کم کیا جائے جو انھیں اندر ہی اندر کھوکھلا کیے جا رہا تھا۔ اسی لیے تو باقر مہدی نے لکھا ہے کہ:

''یگانہ نے اپنے زمانے کے حکمراں ادبی حلقے سے بغاوت کی تھی اور ان کی شاعری ایک تنہا سرکش کا رجز یہ ہے۔''[1]

ملاحظہ فرمائیں ان کے مجموعہ کلام ''آیات وجدانی'' سے چند اشعار جن میں یہ باتیں نہایت واضح انداز میں منکشف ہوتی ہے۔

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا
پڑے ہو کون سے گوشے میں تنہا
یگانہ کیوں خدائی ہو چکی بس

اس احساس شکست، ناکامی و محرومی کے پس منظر میں ان کے ایک نہایت اہم مجموعہ ''گنجینہ'' کے یہ اشعار بھی دیکھتے چلئے جس میں کچھ اسی قسم کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

امید و بیم نے مارا مجھے دو راہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا
بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بد نصیب جسے بخت نا رسا نہ ملا
نگاہ یاس سے بابت سعی لا حاصل
خدا کا ذکر تو کیا بندۂ خدا نہ ملا

ان اشعار کا باغیانہ لہجہ یا کھرا پن کس بات کی غمازی کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ چاہے جو ہو جائے لہجہ کا بانکپن ہاتھ سے نہ جانے دیں گے خواہ شکست ہی کیوں نہ ہو، دوسرے یہ کہ ان میں

1۔ صرف ایک کتاب: گنجینہ باقیات مہدی، مرتبہ یعقوب راہی سن اشاعت 2008 صفحہ 105

ایک قسم کا منفی رجحان پروان چڑھ رہا ہے۔جوان کے لیے سوہان روح ہے لیکن اس پر بھی وہ باز آنے سے رہے۔اسے ان کی ذہنی کیفیت پر ہی محمول کیا جانا چاہیے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ خود اس بات کا اقرار ہرگز نہ کرتے کہ۔

بیگانہ وار ایک ہی رخ سے نہ دیکھئے
دنیا کے ہر مشاہدۂ ناگوار کو

اس ذہنی کیفیت کے ذمہ دار ایک طرف وہ خود تو ہیں ہی دوسری طرف اس لکھنوی ماحول کو بھی مورد الزام قرار دیا جاسکتا ہے جس نے دبستان لکھنو کی خوبیوں کو درکنار کر کے طرز غالب کی تقلید شروع کر دی تھی جس سے مرزا یگانہ متحیر و متعجب تھے کہ یہ کیا ہوا کہ وہ جس بنا پر عظیم آباد سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے کہ انھیں اس دبستان کی جملہ خوبیوں کی بدولت شہرت و عزت مل جائے گی، وہی ان کے حصہ میں آنے سے رہی کہ اب زمانے کا رنگ ڈھنگ ہی اور ہے۔ایسے میں انھوں نے یہ ٹھان لیا کہ وہ اپنے دم پر ہی لکھنوَ دبستان کی غزل گوئی کو سطحی جذباتیت اور لفظی بازیگری سے نجات دلائیں گے۔بقول راہی معصوم رضا:

''یاس نے غزل کو اس کے مستقل کرداروں کی انجمن سے باہر نکالا۔یاس کی غزل میں ناصح ،واعظ ،دربان، رقیب، ترک بچہ، نحیف اور بے غیرت عاشق اور اس قسم کے دوسرے لوگ نظر نہیں آتے ۔یہ کام دراصل غالب نے شروع کیا تھا غالب نے ان کرداروں کی مثالیت پر پہلا وار کیا تھا۔حسرت نے ان کرداروں کو کتابوں کی دنیا سے نکال کر گھریلو بنادیا اور یاس نے سرے سے ان کے وجود ہی کا انکار کر دیا۔''[1]

اس امر کے ثبوت ان کے پہلے مجموعہ کلام ''نشتر یاس'' میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔جو کہ ان کے اولین تخلص کے ساتھ شائع ہو کر منظر عام پر آیا تھا۔ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس مجموعہ میں ذرا سی مصنوعیت بھی نظر آتی ہے یعنی ایسی غمنا کی اور المنا کی جس کا قلب سے کوئی لگاؤ ہی نہیں۔شاید اسی دوئی کی وجہ سے بھی ان کے ہم عصروں سے ان کی ٹھن گئی۔اس پر طرہ یہ کہ وہ تو اپنی

1. یاس یگانہ چنگیزی: راہی معصوم رضا صفحہ 242

بات بیبا کانہ، بے لاگ اور بہ بانگ دہل کہنے والوں میں تھے۔ بہر حال انھوں نے سچ کہا اور کشیدگی بڑھی یہاں تک کہ انھوں نے پورے زمانے کو ہی اپنا دشمن تصور کر لیا، اس میں صفی، محشر، عزیز اور ثاقب وغیرہ کی کوئی قید نہیں تھی۔ یعنی ایک طرف روایتی غزل کی پشت پناہی کرنے والے شعرا تھے تو دوسری طرف جدید غزل کے ہمنوا اور نظم گو شعرا اور پھر ان کے ساتھ ساتھ ترقی پسند شعرا بھی جن میں جوش جیسے قد آور شعرا کا نام نامی سرفہرست ہے۔ ایسے میں یاس، بے آس ہو گئے انھیں یگانہ بننا پڑا، چنگیزی بننا پڑا۔ اسے ان کی ذہنی اپج بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اگر غالب، اپنی گوناں گوں خوبیوں کی بدولت اردو ادب پر غالب ہیں تو یگانہ بھی کسی سے کم نہیں کہ وہ یگانہ (یکتا، بے مثل اور لا جواب) ہیں۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام صرف انھوں نے اپنی منفرد شناخت قائم کرنے کے لیے ہی نہیں اختیار کیا تھا۔ یہاں شاید یہ احساس بھی کارفرما ہو کہ جس طرح غالب نے اسد سے غالب بن کر اردو ادب پر غلبہ پایا شاید ویسے ہی بے مثل وہ یاس سے یگانہ بن کر ہو جائیں۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ وہ بات پیدا نہ ہو سکی جس کا انھیں دعویٰ تھا۔ بقول ممتاز حسین:

> ''ان کی شاعری میں وہ لطف نہیں جو غالب کی شاعری میں ہے۔ ضد کی بات اور ہے ورنہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بقید ہوش وحواس وہ غالب کے منہ کیوں آئے۔ شاید اس لیے کہ غالب کا ریختہ اولاً فارسی محاورے میں تھا۔ اور جا بجا انھوں نے عروضی آزادیوں سے بھی کام لیا ہے۔ اور ایسا ہی غیر معتدل رویہ یگانہ اپنی آتش پرستی میں بھی اختیار کرتے ہیں۔ جب وہ غالب کے اشعار کے مقابلے میں آتش کے اشعار پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں............ جب خودی بگڑ جاتی ہے تو وہ خود پرستی اور خود رائی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ یگانہ خود پرستی اور خود رائی کے شکار ہو گئے۔ یگانہ کے سلسلہ میں ان کی خودی اور یکتائیت کی بات اکثر دھیان میں لائی جاتی ہے اور ان کا یہ دلچسپ شعر بھی نقل کیا جاتا ہے۔

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا“ [1]

پروفیسر ممتاز حسین کے خیالات سے قطع نظر یہ بات سچ ہے کہ مرزا یگانہ کی خود پرستی یا نشۂ خودی میں آتش پرستی کو بڑا دخل ہے شاید اسی بنا پر ان کے یہاں آتش سے جا بجا مماثلت نظر آتی ہے۔ ذرا غور سے دیکھئے، جو بیباک لہجہ اور بانکپن آتش کے یہاں ہے وہی یگانہ کے یہاں بھی نظر آجاتا ہے۔ من وعن نہ سہی عکس جا بجا موجود ہیں، اس سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن ان کی انفرادیت یہ ہے کہ اس ادھیڑ بن میں ایسا بھی نہیں ہوتا کہ ان کے یہاں قدم قدم پر تشبیہوں کے انبار نظر آتے ہوں یا پھر ایسی تراکیب یا صنائع وبدائع سے کام لیا گیا ہو کہ قاری مرعوب ہونے پر مجبور ہو جائے۔ انھوں نے جہاں بھی ان لوازمات شعری سے استفادہ کیا ہے ان کے تخیل کی نادرہ کاری اور طرفگی محسوس کرتے بنتی ہے اور وہ قارئین پر یہ باور کرانے میں کامیاب نظر آتے ہیں کہ ان کا استعمال صناعی کی کوئی شعوری کوشش نہیں بلکہ اس میں فکر کی آنچ، جذبے کی تپش اور فن شاعری کا عنصر موجزن ہے۔

یہ شاعرانہ فن کاری یا ”آرٹ“ کیا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ اپنے مجموعہ ”آیات وجدانی“ میں صفحہ 10 پر رقم طراز ہیں کہ اس کے لیے تین شرطیں لازمی ہیں اول ”نسبت صحیح“، یعنی شاعر جس موضوع پر طبع آزمائی کرنا چاہتا ہو اس کی صحیح واقفیت رکھتا ہو دوم ”خلوص“ اس سے مراد موضوع سے حقیقی دلچسپی ہے اور سوم ”طرز ادا“ وہ یوں کہ اس کے بغیر مندرجہ بالا خصوصیات ہوتے ہوئے بھی عمدہ شعر وجود میں نہیں آسکتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کوئی شاعر، شاعرانہ فن کاری کا متحمل بھی نہیں ہوسکتا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کی شاعری میں یہ فن کاری جسے وہ ”یگانہ آرٹ“ قرار دیتے ہیں دور ہی سے جھلکتا ہے۔ ایسا اس لیے کہ وہ بہ زعم خود یہ باور کرتے ہیں کہ ان کی شاعری میں ایک ایک لفظ اپنی معنویت وافادیت رکھتا ہے جس سے ایک کیفیت شعر پیدا ہوتی ہے۔ شاعری کے تئیں ان کا یہی نظریۂ شعر انھیں منفرد بناتا تھا جس کی بنا پر مرزا یگانہ نے اپنی ادبی اہمیت ثابت کرنی چاہی، بلکہ اسے جتانے کی کوشش کی اور شاید اسی غرض سے انھوں نے لکھنؤ کا رخ بھی کیا تھا۔ ورنہ کیا عظیم آباد میں رہ کر لیلائے شعر وسخن کی زلفیں نہیں سنواری جاسکتی تھیں۔

اس رو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مرزا یاس کی شاعری میں یہ عناصر نمایاں ہیں

---

[1] پروفیسر ممتاز حسین: یگانہ شخص اور شاعری، اعجاز پبلشنگ ہاؤس دہلی 1988 صفحہ 24-23

خصوصاً ان غزلوں میں یہ فن نہایت عمدگی سے نظر آتا ہے جو مشاعروں کے لیے کہی گئی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ان غزلوں میں وہ توانائی اور برنائی موجود نہیں ہے جو کہ مشاعروں کے لیے نہیں کہی گئیں۔ میرے خیال میں ان کی شعری کائنات میں فن کاری ہر جا نمایاں ہے خواہ وہ کلام کسی خاص موقع پر یا فن کی ضرورتوں کے پیش نظر رقم کیا گیا ہو یا کہ اسے خود ان کے اندر موجود الہامی طاقت نے اشعار کا روپ دھار لینے پر، صفحۂ قرطاس پر جگہ بنا لینے پر آمادہ کیا ہو۔ اس باب میں آپ ایسے کئی اشعار ملاحظہ فرمائیں گے جن میں دونوں ہی رجحانات پر مبنی شہپارے پیش کیے گئے ہیں۔ یہاں چند متفرق اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جو مختلف مصرع طرحوں پر پہلے پہل مشاعروں کے لیے ہی کہے گئے تھے۔

جب حسن بے مثال پر اتنا غرور تھا
آئینہ دیکھنا تمھیں پھر کیا ضرور تھا

روشن تمام کعبہ و بت خانہ ہوگیا
گھر گھر جمال یار کا افسانہ ہو گیا

اب چین گنہگاروں کو دم بھر نہیں ملتا
پیاسے ہیں اور آب دم خنجر نہیں ملتا

چلے چلو جہاں لے جائے ولولہ دل کا
دلیل راہ محبت ہے فیصلہ دل کا

بقول یگانہ یہ اشعار ''فکر جدید'' کا نمونہ ہیں جو مشاعروں میں پڑھی گئیں۔ یہاں مرزا کاظم حسین صاحب محشر کے یہاں ہوئے ایک مشاعرے کے چند اشعار درج کرنا لطف سے خالی نہ ہوگا جس میں مرزا محمد رفیع سودا کی مشہور غزل کو مصرع طرح قرار دیا گیا تھا۔ اسی زمین میں یاس نے بھی فکر شعر کی تھی۔ اس غزل کے دو اشعار آپ بھی دیکھیے کہ۔

کس شان سے آتی ہے مری شام مصیبت
وہ دیکھو جلو میں ہے قیامت کی سحر بھی

دیکھے کوئی جاتی ہوئی دنیا کا تماشا
بیمار بھی سر دُھنتا ہے اور شمع سحر بھی

کہنے والے کہتے ہیں کہ جب جناب جاوید نے دوسرا شعر سنا تو وجد کرنے لگے۔ اپنی بیاض میں لکھ لیا اور فرمایا کہ ''ایسا شعر میر ہی کے دل سے نکل سکتا ہے''۔ کسی شعر کی اس سے بڑھ کر تعریف اور کیا ہو سکتی۔ یہاں ''شام مصیبت'' اور ''قیامت کی سحر'' سے کیا خوب سماں باندھا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں ''بیمار کا سر دھننا'' کہ اب تو وقت آخر ہے اور اسی مناسبت سے ''شمع سحر'' کیا پیاری تشبیہ ہے۔ ان کے نوک قلم سے اس قسم کے بہت سے اشعار نکلے ہیں، مرزا صاحب اس پر جس قدر فخر کریں بجا ہے۔ اسی سے ملحق مرزا یاس کی غزل کے چند اشعار اور ملاحظہ فرمالیں جس میں ''دفتر کھلا''، ''منظر کھلا'' اور ''در کھلا'' وغیرہ قوافی وردیف کو بڑی شان سے برتا گیا ہے۔

واں نقاب اٹھی کہ صبح حشر کا منظر کھلا — یا کسی کے حسن عالم تاب کا دفتر کھلا
غیب سے پچھلے پہر آتی ہے کانوں میں صدا — اٹھو اٹھو رحمت رب علا کا در کھلا
آنکھ جھپکی تھی تصور بندھ چکا تھا یار کا — چونکتے ہی حسرت دیدار کا دفتر کھلا
کوئے جاناں کا سماں آنکھوں کے آگے پھر گیا — صبح جنت کا جو اپنے سامنے منظر کھلا
رنگ بدلا پھر ہوا کا، مے کشوں کے دن پھرے — پھر چلی باد صبا پھر مے کدے کا در کھلا
گر پڑے تیورا کے آنکھوں میں اندھیرا آگیا — واں نقاب رخ اٹھی یاں رازِ سرتا سر کھلا
بند آنکھیں ہوگئیں بے تاب ہو ہو کر گرے — سامنے پیاسوں کے کس نے رکھ دیا ساغر کھلا
اشک خوں سے زرد چہرے پر ہے اک طرفہ بہار — دیکھئے رنگ جنوں کیسا مرے منہ پر کھلا
صحبت واعظ میں بھی انگڑائیاں آنے لگیں — راز اپنی مے کشی کا کیا کہیں کیوں کر کھلا
ہاتھ الجھا ہے گریباں میں تو گھبراؤ نہ یاس — بیڑیاں کیوں کر کٹیں زنداں کا در کیوں کر کھلا

یہ غزل بہت طویل ہے، اس لیے صرف چند اشعار ہی درج کیے گئے جن کی قرأۃ سے یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ مرزا یگانہ کی شاعری میں ایک عجیب بانکپن اور مردانہ پن ہے۔ میرے خیال میں یہی خوبی ان کی شاعری کو ایک منفرد احساس اور ادراک سے سرشار کرتی ہے۔ اس کی وجہ

یہ ہے کہ انھوں نے حالی کی اصلاحی تحریک کے زیر اثر مبتذل اور عامیانہ خارجیت کو ترک کر کے اس خارجیت اور داخلیت کو اپنایا تھا جو ان کے زمانے کے لکھنؤ کا چلن ہرگز نہ تھا کہ اس دور میں نیرنگ زمانہ کی بدولت حد درجہ انفعالیت حاوی ہوگئی تھی۔ شاید اسی لیے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنے مضمون جدید تر غزل میں اس قسم کا خیال پیش کیا:

> ''بعض شعرا کا خیال تھا کہ غزل ضرورت سے زیادہ انفعالیت کا شکار ہوگئی ہے۔ اس لیے اسے ایک مردانہ لہجہ اور صلابت عطا کرنے کے لیے خارجیت کو بھی ایک حد تک اپنانا چاہیے۔ یگانہ اور شاد عارفی نے اس عنصر کو ایک بار پھر اپنی غزل میں جگہ دی۔ یگانہ اور شاد دونوں زبان اور فن پر بڑی قدرت رکھتے تھے اور ان کے یہاں ایک طرح کی تلخی اور طنزیاتی روح ان کے مزاج کا فطری عنصر معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے انھوں نے اس خارجیت سے خاصا کام لیا۔''[1]

بہر حال یگانہ کے یہاں موجود اس نفسی کشاکشی نے بھی ان کے کلام کو نئے رنگ ڈھنگ سے آشنا کیا جس میں ان کی کج کلاہی اور طرز ادا کے بانکپن، نیز لہجہ کی پختگی نے اہم کردار ادا کیا اور وہ غزل جیسی صنف سخن کو واردات قلبی کا نمونہ بنا کر پیش کر سکے۔ لیکن ان کی خود پرستی، ایذا پسندی اور انانیت جیسے منفی رجحانات نے انھیں کس قدر نقصان پہنچایا یہ سب پر منکشف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شاعرانہ مرتبہ کے تعین میں بھی خاصی دشواری پیش آئی کہ انھیں کئی بار شاعر ہی نہ گردانا گیا۔ اور کئی بار تذکرہ نگاروں اور ناقدین نے ان پر توجہ نہیں دی اور ان کے ساتھ ناانصافی ہوتی چلی گئی، حد تو یہ ہے کہ ان کا نام جدید غزل کے معماروں کی فہرست تک میں نہ آیا۔ حتیٰ کہ یگانہ اس عہد میں خاصے مقبول تھے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ شعرالہند کے مصنف پروفیسر عبدالقادر سروری کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے زمانے میں کوئی یگانہ چنگیزی جیسا شاعر بھی موجود ہے۔ اسی طرح پروفیسر کلیم الدین احمد نے بھی ''اردو شاعری پر ایک نظر'' کی کئی اشاعتوں میں انھیں یک قلم نظر انداز کر دیا کچھ یہی رویہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے ''اردو غزل'' میں بھی اختیار کیا۔ اسے اردو

1۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی: جدید تر غزل، سہ ماہی فنون، لاہور، جدید غزل نمبر حصہ اول صفحہ 72

شاعری کی تنقید یا اس کے سرخیل ناقدوں کی شعوری یا لاشعوری کوشش، ایک سوچی سمجھی مہم یا پھر ایک المیہ ہی کہا جانا چاہیے کہ فراق گورکھپوری، احتشام حسین، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ممتاز حسین وغیرہم نے اردو شاعری اور اردو غزل کے بارے میں بہت کچھ لکھنے کے باوجود مرزا یگانہ کے بارے میں کچھ بھی لکھنا مناسب نہیں سمجھا، یا وہ ان بھی ناقدین کی ترجیحات کے متحمل نہ ہو سکے یا پھر کچھ یوں ہوا کہ اس دور کے ناقدین تعصبات کے دائرے کو عبور نہ کر سکے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسا ذہین ناقد بھی ان سے متعلق خامہ فرسائی نہ کر سکا، ہاں انھوں نے اپنے مقالہ ''جدید غزل'' میں ایک جگہ ان کا نام لیا ضرور ہے لیکن اس میں بھی نہ ان کی تعریف و تنقیص کی گئی نہ ہی تنقید۔ ان کا ذکر ضمناً آ گیا، وہ بھی مجروح سلطان پوری کو عبرت دلانے کی غرض سے ایک جملہ لکھتے ہوئے۔ کچھ یہی رویہ ان کے وقت کے دیگر ناقدین کا بھی تھا۔ مثلاً پروفیسر آل احمد سرور نے ''نگار'' کے غزل نمبر میں غزل گو شعرا پر اظہار خیال کرتے ہوئے یگانہ کو غزلوں سے زیادہ رباعیات اور قطعات کا شاعر قرار دے کر فرصت پالی تو ممتاز حسین نے بہت بعد میں ان پر ایک طویل مضمون لکھا لیکن وہ بھی بسا اوقات ان کی شخصیت کے منفی پہلوؤں کی گرفت کرتے ہی نظر آئے۔ انھوں نے بھی ان کے فن پر ویسی روشنی نہیں ڈالی جو کہ اس نابغۂ روزگار کا حق تھا۔ اسی طرح حسن عسکری نے بھی انھیں داد و تحسین سے نہیں نوازا۔ اور جب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' شائع کی تو ان کا ذکر معمولی شعرا کے ساتھ کر کے سرسری گزر گئے۔ کیا اسے سوچا سمجھا اور عمداً اپنایا گیا رویہ نہیں قرار دیا جانا چاہیے۔ اگر اسے غالب دشمنی کا صلہ بھی سمجھا جائے تو بے جا نہیں لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ ''چراغ سخن''، ''غالب شکن'' یا ''شہرت کاذبہ'' کے مصنف کی شاعری میں اس قدر توانائی ضرور ہے کہ اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا، اسے قابل صد احترام نہیں گردانا جائے، نہ سہی لیکن اسے سرے سے خارج ادب قرار دے دیا جانا کہاں کا انصاف ہو سکتا ہے۔ میری نظر میں یگانہ کی حد تک ایسا کرنے والوں کو محمد حسین آزاد کے قبیل کا نقاد کہنا بے جا نہیں کہ وہ جنھیں چاہیں آسمان پر بٹھا دیں اور جسے چاہیں پستی کی جانب ڈھکیلنے سے بھی نہ چوکیں۔ یہ ادبی بد دیانتی تھی جو یگانہ کے ساتھ روا رکھی گئی لیکن جرأت یگانہ بھی دیکھئے کہ وہ اپنی روش پر قائم رہے، وہ عجیب مٹی کے بنے تھے کہ سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے بھی ایسی قوت

برداشت کا مظاہرہ کیا کہ اپنی نظیر آپ بن گئے۔ دیکھیں یہ شعر جو انھوں نے شاید اسی غم کو بھلانے کے لیے تراشے تھے کہ۔

دل طوفاں شکن تنہا جو تھا آگے سو اب بھی ہے
بہت طوفان ٹھنڈے پڑ گئے ٹکرا کے ساحل سے

آج اردو شاعری کی تنقید کے اس رویہ میں بہر طور تبدیلی آئی ہے۔ بقول مرزا یگانہ ان کے خلاف جو طوفان تھا وہ یقیناً ٹھنڈا پڑ گیا ہے، اور اب دنیائے تنقید شعر و ادب انھیں ان کا جائز مقام دینے سے نہیں چوکتی۔ اردو تنقید کے ممتاز ترین ناقدین میں شاید صرف مجنوں گورکھپوری کو ہی یہ افتخار و امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے مرزا یگانہ کی شاعرانہ اہمیت کو سب سے پہلے پہچانا، وہ ہمیشہ سے ان کی شاعری کے معترف اور مداح رہے ہیں۔ بغور دیکھا جائے تو یگانہ سے متعلق اہم ترین تنقید ان ہی کے نوک قلم کی زینت بنی ہے۔ مجنوں گورکھپوری کے علاوہ جن لوگوں نے یگانہ کی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ان کا تعلق جدید ترین نسل سے ہے اور مجھے بارہا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدید ترین نسل اپنے ادبی بزرگوں سے جن باتوں میں اختلاف رکھتی ہے وہ ان کی تعصب سے پرے تنقیدی سوجھ بوجھ بھی ہے۔ جدید ناقدین نے یگانہ چنگیزی کی شاعری کی جس قدر بھی تنقید کی ہے وہ بہت حد تک تعصبات سے پاک بھی ہے اور اسی رو سے نہایت اہم بھی۔ بہر حال ان کی ادبی حیثیت کو رد کرنے کے رویہ سے یگانہ چنگیزی پر منفی اثر پڑا ہو، اور ایسے میں وہ چیخ پکار کرنے لگے ہوں اور پوری ادبی دنیا سے بیزار ہو گئے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ یہ بھی ایک فطری امر ہے۔ کیا ایسا نہیں ہونا چاہیے؟ سماج کے ایک حساس شاعر و ادیب کا ردعمل اسی طرح ظہور پذیر ہونا تھا سو ہوا۔

اپنا گھر اپنی زمیں اپنا فلک بیگانہ
آشنا کوئی بجز سایۂ دیوار نہیں

میری بہار و خزاں جس کے اختیار میں ہے
مزاج اس دل بے اختیار کا نہ ملا
دلیل راہ دل شب چراغ ہے تنہا
بلند و پست میں گزری ہے جستجو کرتے

مرزا یگانہ کی کائنات شعر میں اس قسم کے اشعار کی افراط ہے لیکن ان کی تلخ نوائی کا بکھان اس قدر کیا گیا کہ ان کی ان خوبیوں کو گھن لگ گیا جو ان میں موجود تھیں۔ ورنہ کیا عجب ہے کہ اس قدر ذہین و فطین شخص کو اس کا حق نہ مل پاتا اور وہ تا عمر انتشار و خلفشار سے مد مقابل رہتا۔ یگانہ کے کلام کا تجزیہ کرتے وقت یہ بات ملحوظ نظر رہنی چاہیے کہ وہ بھی اپنے عہد کے عام انسانوں کی طرح گوشت و پوست کے ایک انسان تھے ان کے رجحانات بھی ویسے ہی تھے جیسے کہ کسی عام شخص کے ہوا کرتے ہیں یعنی ایک داخلی تو دوسرا خارجی۔ ظاہر ہے ایک فن کار دونوں ہی رجحانات سے اثر انداز ہوتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں دونوں ہی کا بیان ہے جو کہ اکثر تضاد پیدا کرتا ہے۔ اردو کے تمام شعرا میں یہ بات صرف یگانہ کے ہی بس کی تھی کہ وہ اس قدر ٹوٹنے بکھرنے کے بعد بھی فن کے اسرار و رموز کو نہایت پامردی و استقلال سے سہارتے رہے۔ انھوں نے شکست و ریخت کے باوجود فرار یا گریز پائی کو قریب نہیں آنے دیا اور نہ ہی اسے ذہنی عیاشی کا ذریعہ بننے دیا بلکہ شاعری کی دیوی کو ویسے ہی پوجتے رہے جیسا کہ اس کا حق تھا۔ شاید یہ وجہ بھی رہی ہو کہ کئی مرتبہ ان کے متعلق یہ کہا گیا کہ ان کے یہاں کوئی جامع یا مربوط فلسفۂ زندگی نظر نہیں آتا، ایسا کیوں کر ممکن ہوتا کہ اس کی بڑی وجہ زندگی کے تئیں ان کا وہ غیر مربوط فلسفۂ زندگی ہے، جو کہ خود ان کا وضع کردہ تھا اور وہ اسی پر کاربند رہنے کو احسن سمجھتے تھے۔

مرزا یگانہ نے اپنا تصور شعر بیان کرتے ہوئے حالی سے بخوبی استفادہ کیا ہے جس کا ذکر پہلے بھی کیا گیا، شاید یہی وجہ ہے کہ جب انھوں نے ''نشتر یاس'' میں ''ماہیت شعر'' سے متعلق اپنے خیالات درج کیے تو ان کی زبان سے کئی دفعہ حالی ہی بولتے ہوئے نظر آئے۔ اس سلسلہ میں وحید قریشی کا بیان قبول کرلیا جائے تو شاید بے جانہ ہوگا کہ مرزا یگانہ کی تصنیف ''چراغ سخن'' مقدمہ شعر و شاعری کی پیروی میں لکھی گئی۔ انھوں نے اپنے تصور شعر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''شعر و سخن کو میں ایک مقدس فن سمجھتا ہوں اور اس فن میں مجھے جس قدر انہماک ہے وہ اسی نقطہ سے ہے'' وہ بھی حالی کی طرح مقتضائے حال اور اصلیت کو تخیل کی بنیاد سمجھتے ہیں اور انھیں بھی شاعری کے لیے تین شرطوں پر اصرار ہے یعنی طبیعت کا لگاؤ (نسبت صحیح)، تخیل (خلوص۔ اس کے بغیر تخیل کو پر پرواز مل ہی نہیں سکتی) اور قوت بیانیہ (طرز ادا)۔ اور پھر شعر کے بنیادی عناصر میں تخیل

کے علاوہ محاکات اور موسیقیت کا بھی اہم گردانناان کے تصور شعر کو بااثر بناتا ہے۔ ان کی شعری فتوحات میں ان سبھی نظریات شعر کا پرتو نظر آتا ہے کہ وہ خود بھی ان اصولوں پر تاحیات قائم رہے۔

آیئے اب ان ہی کے ایک قول کی روشنی میں بات آگے بڑھائی جائے کہ وہ غزل کو کس نہج پر استوار کرنا چاہتے تھے۔ ''ماہیت شاعری'' میں وہ لکھتے ہیں کہ غزل کی بنا محض جذبات پر ہے اور جذبات میں غم نسبتاً زیادہ موثر اور دلکش ہوتے ہیں۔ یہ تاثر اور دلکشی ان کی غزلوں میں بھی ہے اس میں شک نہیں۔ جذبات غم کے پس منظر میں دیکھیں ان کی غزل کا یہ مطلع جس میں انھوں نے ایک کربناک تاریخی واقعہ کو نظم کیا ہے۔ نہایت موثر اور دلکش پیرایۂ بیان میں وہ کہتے ہیں۔

بندہ وہ بندہ جو دم نہ مارے

پیاسا کھڑا ہو دریا کنارے

چہ جائیکہ یہ غزل کا شعر ہے لیکن جذبات غم کے حوالے سے اس شعر کو واقعہ کربلا کے اس پس منظر میں محسوس کیجیے کہ جب فرزند حضرت علی، امام حسین اپنے نانا کے دین کی بقا کی خاطر میدان کارزار میں ہیں اور ان کے باوفا بھائی جناب عباس تن تنہا دریائے فرات پر قبضہ کیے پیاسے کھڑے ہیں، کیا دلدوز منظر ہے۔ لفظوں کے سہارے جناب عباس کا پیکر تراش دینا بلکہ خیام حسینی سے نہر فرات تک کا سماں تخلیق دے دینا، ہمیں ایک عجیب سی کیفیت سے سرشار کرتا ہے۔ کیا اسے یگانہ کی فن کاری اور ان کے تخیل کی نادرہ کاری پر محمول نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہاں نسبت صحیح، خلوص اور طرز ادا سبھی نکات بڑی عمدگی سے برتے گئے ہیں۔ آیئے اسی پس منظر میں اس قسم کا ایک شعر اور ملاحظہ فرمائیں جس میں استعارات کربلا اپنی منتہا پر ہے۔

کس شان سے آتی ہے مری شام مصیبت

وہ دیکھو جلو میں ہے قیامت کی سحر بھی

اگر میں یہ کہوں کہ یہاں بعد قتل حسین ''شام غریباں'' کو موضوع بنایا گیا ہے تو کسی کو گراں نہ گزرے گا، چہ جائیکہ یہ بھی ان کی مشہور ترین غزل کا شعر ہے۔ یگانہ نے اس میں خیام حسینی کو نذر آتش کر دیے جانے، اہل حرم کے مال واسباب لوٹ لیے جانے کو موضوع بنایا ہے یہاں

زیریں لہروں کے طور پر نہ جانے کس کس قسم کے مظالم کا بیان ہے۔ اس کا اندازہ واقعہ کربلا سے واقفیت رکھنے والے قارئین بخوبی لگا سکتے ہیں۔ شاعر کا یہ کہنا کہ مصائب یہیں ختم نہیں ہوئے بلکہ شاعر اس کے بعد ہونے والی اس سحر کا ذکر بھی کرتا ہے جس میں خانوادۂ رسول کو دار و رسن کی آزمائش سے گزرنا ہوگا، انھیں سر بازار بے مقنع و چادر کشاں کشاں پھرایا جائے گا اور یہ لا متناہی سلسلہ کب ختم ہوگا کون جانے۔ یہاں ''شام مصیبت'' اور ''قیامت کی سحر'' سے وہ شاعرانہ فن کاری دکھائی گئی ہے کہ غزل کا شعر مرثیہ کا شعر بنتا نظر آ رہا ہے۔ یگانہ کی شعری کائنات میں اس قسم کے اور کئی اشعار مل جائیں گے جس میں جذبات غم کی عکاسی کی گئی ہے، نہایت موثر اور دلکش انداز میں، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ یگانہ نے کبھی بھی عمداً کربلائی شاعری نہیں کی یعنی انھوں نے نوحے، سلام یا مرثیہ وغیرہ پر طبع آزمائی سے گریز ہی کیا۔ اس کی خالص وجہ صرف یہ تھی کہ وہ خود کو کسی خاص فرقہ سے جوڑ کر نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ تا حیات اپنی شناخت بحیثیت شاعر اور بحیثیت انسان ہی قائم کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ اور انھوں نے جو بھی نظریۂ زندگی یا نظریۂ شعر قائم کیا اس کی نشر و اشاعت کو ہی اپنا مذہب و عقیدہ گردانا۔

ان چند اشعار سے قطع نظر مرزا یگانہ کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے غم کو، اپنی پسپائی کو بھی کئی بار موثر اور دلکش انداز میں اس لیے نہیں پیش کر سکے کہ ان کے یہاں ذکر کربلا اور فکر کربلا کا عنصر اس قدر موجزن نہیں تھا جیسا کہ اس معرکہ حق و باطل سے ہمیں سبق ملتا ہے۔ چہ جائیکہ وہ اس کے داعی تھے کہ وہ یزیدی فوج (ان کے لکھنوی مخالفین) سے نبرد آزما ہیں اور اپنے حسینی مسلک پر ثابت قدم۔ جہاں تک میری نگاہ جا سکی ہے ان سے یہ بھی ممکن نہ ہو سکا کہ وہ خود کو فانی کی طرح قنوطیت تک ہی محدود رکھ پاتے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کا غم و غصہ زہر خند بن گیا جس کی بنا پر ان کے نوک قلم سے اس قسم کے اشعار نکلتے چلے گئے کہ واہ! واہ! کی جگہ الحفیظ و الامان ہی کہتے بنتا ہے۔ ان کا یہ رویہ خود اذیتی کا اظہار تو تھا ہی دوسروں کو بھی ذہنی کوفت میں مبتلا کر دینے والا تھا۔ اگر ایسا اس لیے بھی ہو کہ وہ ایک حقیقت پسند شاعر تھے جس کی فکر اس کے تجربات کی پروردہ تھی تو بھی انھیں اس سے گریز برتنا چاہیے تھا، یا پھر اسے ذرا مثبت طرز تخاطب کے سہارے پیش کرنا چاہیے تھا جو کہ ان کی فن کاری کا منہ بولتا ثبوت بن کر ابھرتی لیکن اسے تو وہ فن کاری مانتے

ہی نہیں تھے بلکہ اسے ریاکاری تصور کرتے تھے شاید یہی وجہ تھی کہ یہ بھی ان سے ممکن نہ ہو سکا۔ خیر اس کا اعتراف انھوں نے کچھ یوں کر لیا ہے کہ ان کی شاعری ان کی عملی زندگی کا آئینہ ہے۔ جس میں اس قسم کی مصلحتوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ دیکھیں یہ اشعار جو اسی منشور کے زیر اثر رقم کیے گئے ہیں۔

خدا کے سامنے دامن پسارنے والے
وہ ہاتھ تھک گئے کیا مال مارنے والے

کیا خبر تھی یہ خدائی اور ہے
ہائے میں نے کیوں خدا لگتی کہی

ترک لذت دنیا کیجئے تو کس دل سے
ذوق پارسائی کیا فیض تنگ دستی ہے

بہا لے گیا گھر بھی ابر کرم
جو بویا تو کیااور نہ بویا تو کیا

بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دست ہوس
گھٹتے گھٹتے ایک دن دست دعا ہو جائے گا

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

حاصل فکر نارسا کیا ہے
تو خدا بن گیا برا کیا ہے

انوکھی معرفت اندھوں کو حاصل ہوتی جاتی ہے
حقیقت تھی جو کل تک آج باطل ہوتی جاتی ہے

ہاں یہ اشعار اس بات پر ضرور دلالت کرتے ہیں کہ وقتی فائدوں کے لیے انھوں نے کبھی بھی اپنے فن کو مجروح نہیں ہونے دیا اور اس میں زندگی کی حقیقتوں کا بیان کرتے رہے چہ

جائیکہ اس میں خاصی دشواری پیش آئی، انھوں نے نہ صرف خود کو سنبھالے رکھا بلکہ اپنے فن اور اپنی زندگی کو متحرک بنا کر اس کی معنویت ثابت کرتے چلے گئے۔ اسی حوالے سے وہ ہمیں یہ درس دینے میں بھی کامیاب رہے کہ ایک ادیب و شاعر اپنے ماحول کی مسموم فضا، خوشامدانہ ماحول، عیارانہ فن کاری اور بزدلانہ ادب نوازی سے کس طرح بے اعتنائی برتتے۔ اسی لیے تو باقر مہدی نے اپنے ایک نہایت اہم مضمون ''یگانہ آرٹ'' میں ان کے متعلق بڑا خوب صورت خیال پیش کیا کہ

> ''ان کی شاعری شیشہ گری نہیں کرتی وہ شکست و ریخت میں یقین رکھتے ہوئے بھی جدوجہد کا پیغام دیتے ہیں...... وہ لکھنؤ کے شعرا سے لڑائی کر کے ادبی دنیا میں وقتی طور پر کامیاب نہ ہو سکے لیکن انھوں نے اپنے کلام میں مردانگی، بانکپن، نشاط، مزاح اور فکری عناصر کے امتزاج سے وہ جوہر ضرور پیدا کر دیا جو ان کو فاتح بناتا رہا۔ ان کے یہاں الفاظ کی بندش، محاورات کی سادگی، تراکیب کی خوب صورتی، تشبیہات کی قدرت بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اور کوئی بھی انصاف پسند ناقد ان کی شاعرانہ اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔ ان کا شعری لب ولہجہ نہ صرف اس دور کے اردو غزل گو شعرا سے الگ ہے اور بہتر ہے بلکہ اردو کے کلاسیکی شعرا کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے اور اسی میں یگانہ آرٹ کی عظمت مضمر ہے۔ وہ اپنے مرتبے سے واقف تھے یا نہ تھے لیکن وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ ایک فن کار کے لیے خود اعتمادی ضروری ہے اور انھوں نے اپنی فطری صلاحیتوں پر اس سے صیقل کی ہے...... یگانہ کا آرٹ وہ آئینہ ہے جس میں ایک بلند شخصیت کے شاعر کی تنہا جدوجہد کی پوری داستان چھپی ہوئی ہے۔''[1]

باقر مہدی کا یہ بیان کہ ان کا کلام اردو کے کلاسیکی شعرا کے مقابلے پیش کیا جا سکتا ہے بجا ہو کہ نہ ہو۔ لیکن اتنا تو طے ہے کہ مرزا یگانہ نے اگر ایک طرف فارسی کے اہم شعرا مثلاً عرفی و صائب

1. باقر مہدی: شعری آگہی، صفحہ 81 - 76

سے خوب استفادہ کیا ہے تو دوسری جانب ہمارے اہم شعرا میر، غالب و آتش سے بھی فیض حاصل کیا جس کا ان کی شاعری پر خاصا اثر مرتب ہوا۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ ان شعرا کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے لیکن کوشش ضرور کی، یہی کیا کم حوصلے کی بات ہے۔ لیکن بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے ذریعہ جو مشق سخن کی گئی ان میں خواہ وہ اساتذہ کی زمینوں پر مشاعروں کے لیے کہی گئی غزلیں ہوں یا میر و آتش کی پیروی میں کی گئی شاعری سبھی جگہ وہ اپنی دھن میں ہیں، اور اسی دھن میں وہ اپنے لیے ایک نیا راستہ تلاشتے نظر آتے ہیں۔ جس میں تنقید عصر کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ شاید اسی لیے ممتاز حسین نے ان کے متعلق کچھ اس قسم کے خیالات پیش کیے تھے کہ:

> ''بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یگانہ کی شاعری کا موضوع خود پرستی ہے مگر ان کی خود پرستی محیط ہے۔ حیات انسانی کی تفہیم اور اس کی تنقید و تشریح پر، اور چونکہ حیات انسانی کو کائنات اور قضا و قدر کے رشتوں کے بغیر سمجھنا مشکل ہے اس لیے ان کے بارے میں بھی یگانہ نے اظہار خیال کیا ہے۔ مگر کس طرح؟ ایک شاعر کے طرز سخن میں جو شخص جذبات سے مملو ہوتا ہے۔ یگانہ کوئی فلسفی نہ تھے جو بھولے سے شاعری کے میدان میں آ گئے تھے۔ وہ ایک حقیقی شاعر تھے ان کی فکر ان کے اپنے تجربات زندگی کی پروردہ تھی۔ چنانچہ اس لیے ان کی فکر میں ایسے تضادات بھی ہیں جو بدلتے ہوئے موڈ یا تغیر کیفیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ کبھی جبر تو کبھی اختیار کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ مگر نہ اس طرح کہ دونوں میں تضاد نہ ہو۔ زندگی کی کئی صورت حال ایسی ہیں جو پر تضاد ہیں اور کیا عجب، جو آدمی کی زندگی ہی مجموعہ اضداد ہو۔ ایسی صورت میں کس قسم کی حرف گیری غالباً جائز نہ ہوگی۔ کہ انھوں نے کہیں کہیں اپنے ہی کو مسترد بھی کیا ہے۔ لیکن جب یگانہ کی مجموعی فکر کا احاطہ کیا جائے گا تو ان کے فلسفیانہ اور مذہبی عقائد کے بہت سے واضح خطوط ابھریں گے اور ان کا شمار ایسے شاعروں میں کیا جائے گا جن کا کوئی مثبت پیغام بجز تنقید عصر نہیں۔ یگانہ چنگیزی بغیر

کسی تلوار کے تھے لیکن وہ نوک قلم سے کام تلوار کا لیتے۔''[1]

مرزا یگانہ کی شاعرانہ فن کاری خدا کی ذات، مذہب، آرٹ اور انسانی زندگی کے مسائل اور اس کی بوالعجبیوں کے بیان میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔خصوصاً تشکیک اور الحاد یا مذہب بیزاری میں جس کی وجہ سے وہ معتوب بھی ٹھہرائے گئے۔اس سلسلے میں ملک اسمٰعیل خان کے اس قول سے رہنمائی ملتی ہے:

> ''یگانہ کے یہاں غالب کی طرح'' تشکیک'' کا ایک رجحان بھی ملتا ہے جس میں انھوں نے مذہب اور خدا اور دیر و حرم کے بارے میں شبہہ میں ڈال دیا ہے۔انھوں نے کئی جگہ اپنے ان شبہات کا اظہار طنزیہ انداز میں کیا ہے۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی منزل مقصود یا مرکز حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں۔''[2]

ان کی شاعری اور فن کاری کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ وہ فن اور ادب کو تمام نوع انسانی میں تال میل کا ایک عمدہ ذریعہ جانتے ہیں۔اسی لیے انھوں نے اپنے مضمون'' آرٹ اور مذہب'' میں ایک جگہ لکھا بھی ہے کہ'' آرٹ کوئی سا ہو(موسیقی یا شاعری) تمام انسانوں میں ایک خاص ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔''اس مقام پر یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ انھوں نے مذہب پرستی کو ذہنی و جسمانی غلامی سے تعبیر کیا ہے ایسا اس لیے کہ ان کی نظر میں دنیا میں مذہب کے نام پر ہی تمام قسم کی برائیاں پروان چڑھ رہی ہیں جن سے مذہب کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں۔شاید اسی لیے انھوں اس مذہب کو خبط مذہب قرار دیا جو انسانوں کے سر پھرا دیا کرتا ہے۔کیا اس بات میں کارل مارکس کا انداز نہیں نظر آتا جس نے مذہب کو افیون قرار دیا تھا۔جس کا اثر ہمیں جنون کی حد تک مدہوش کر دیتا ہے۔دیکھئے یگانہ کا یہ شعر جوان کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے:

سب ترے سوا کا فر آخر اس کا مطلب کیا
سر پھرا دے انساں کا ایسا خبط مذہب کیا

1۔ پروفیسر ممتاز حسین: یگانہ شخص اور شاعری، اعجاز پبلشنگ ہاؤس دہلی 1988 صفحہ 9-8

2۔ ملک اسمٰعیل خان: یگانہ کا مرتبہ بحیثیت غزل گو، نقوش، صفحہ 278

شاید ان کے اسی خیال سے متاثر ہو کر ممتاز حسین نے جواباً کچھ اس قسم کی تنقید کی تھی کہ اگر وہ خبط مذہب کو اس قدر برا تصور کرتے ہیں تو خود خبط اصلاح ادب اور تکمیل کردار میں کیوں مبتلا تھے۔ آخر خبط تو خبط ہی ہوتا ہے خواہ کسی قسم کا ہو۔ دیکھیں یہ اقتباس:

> ''......وہ خود جس خبط میں گرفتار تھے اس کے شدائد دیکھ نہیں پاتے تھے۔ ان کا وہ خبط اصلاح ادب اور تکمیل کردار کا تھا۔ یگانہ کو اپنے کردار پر ناز تھا لیکن ان کی زندگی میں جو ریاضت اپنے کردار پر قائم رہنے، اپنی کھال میں مست رہنے اور اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلانے کی ملتی ہے۔ چنانچہ وہ اقبال اور غالب پر اس لیے معترض تھے کہ وہ کردار کے غازی نہ تھے۔''[1]

ممتاز حسین کا یہ اعتراض کوئی جواز نہیں رکھتا کیونکہ مرزا یگانہ بہر حال پہلے یا تنہا ایسے شاعر و ادیب نہیں ہیں جنھوں نے اصلاح ادب کا بیڑا اٹھایا تھا۔ یہ کام تو استاد سخن شیخ امام بخش ناسخ اور ان سے قبل اور بعد کے کئی سرخیل ادب کر چکے تھے، اس کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ناسخ تو اسی بنا پر اپنے عہد کے ادبی ڈکٹیٹر کہلائے بلکہ ان کی شناخت تو ایک شاعر کے بجائے مصلح زبان کی ہو کر رہ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں ان کے نام سے ''ناسخ اسکول'' کی بنیاد پڑی۔ میرے خیال میں خلوص کی کمی کے باعث یگانہ یہ کارنامہ نہ انجام دے سکے بلکہ وہ ایک ادبی محتسب کے طور پر مطعون کیے گئے، اب کس کو کیا ملا یہ مقدر کی بات ہے۔ اسی طرح اگر یگانہ کے ذریعہ مذہب بیزاری کو موضوع بنانے کی بات کی جائے تو بھی اس صف میں غالب و اقبال کے نام نامی سرفہرست آئیں گے۔ لیکن ان کے ساتھ ویسا سلوک نہ ہوا جو یگانہ کے سلسلے میں روا رکھا گیا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ یگانہ کی آواز ذرا تند اور طنز آمیز ہے بلکہ یوں کہیں کہ یہ آواز منفی صورت اختیار کر گئی ہے جو ان کی رسوائی کا سبب بھی بنی۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ سب کچھ ایک ہی جیسا ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ کہیں کہیں ان کی بات ذہن پر بھی اثر انداز ہوتی اور دل کو بھی چھو جاتی ہے۔ دیکھیں یہ شعر جس میں وہ کچھ ایسا ہی انداز اختیار کر گئے ہیں اور ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ وہ کسی

---

1 1 پروفیسر ممتاز حسین: یگانہ شخص اور شاعری، اعجاز پبلشنگ ہاؤس دہلی 1988 صفحہ 10

مصلح قوم سے کم نہیں۔

کہیں رسمی عبادت روح کو بیدار کرتی ہے
نماز بے عمل سے حق مذہب رائیگاں کیوں ہو

یہ ان کا طنزیہ انداز ہے ورنہ وہ تو مذہبی معاملات میں ذرا آزاد خیال ہی واقع ہوئے تھے۔اس میں ان کی خودسری نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور وہ کچھ اس طرح گویا ہوئے کہ۔

تقلید کا بندہ نہیں خود سر ہوں میں
واللہ ایک آزاد سخن ور ہوں میں
وہ موج نہیں جسے ساحل روکے
دھارا ہوں آج کل سمندر ہوں میں

میری نظر میں یہ رباعی ان کی ذہنی کوفت کا ایسا بیانیہ ہے جس پر توجہ دینا لاحاصل ہے۔ ہاں! ان کے اس قول پر ضرور توجہ دی جانی چاہیے جس میں انھوں نے آزادیٔ فکر اور سوچنے سمجھنے کے حق سے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''غضب تو یہ ہے کہ آزادیٔ فکر، سوچنے اور سمجھنے کا حق بھی مذہب نے چھین لیا۔وہ یوں کہ مذہب نے اپنی اپنی کتابوں میں جس بات کو جس طور پر سمجھا دیا ہے اس کے علاوہ کچھ نہ سوچو، نہ سمجھو ورنہ کافر ہو جاؤ گے......یہ تو رہی ذہنی غلامی اور انسان کے جسم کو غلام بنا لینے کے تو باقاعدہ احکام موجود ہیں اور ان پر عمل بھی ہوتا رہا ہے۔''[1]

یہ تو ان کی زندگی کا ایک رخ تھا،میرے خیال میں اس کا ذکر اس لیے ناگزیر تھا کہ اس سے ان کی شاعری اور فن پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ کس نہج پر استوار ہوئی۔مرزا یگانہ کے حالات زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں شوق وصل یا عشق کا کوئی ویسا تجربہ نہیں ہوا تھا جس کی چوٹ کو،جس کی خلش کو وہ اپنی غزلیہ شاعری کا موضوع بناتے اسی لیے تو ایک جگہ انھوں نے لکھا بھی ہے کہ شوق وصل کے مضامین سے انھیں نفرت سی ہوتی ہے۔شاید اسی نفرت نے،اسی کمی نے

---

1. یگانہ: آیات وجدانی (جدید)

ان کے کلام میں ایک آنچ کی کسر باقی رکھی۔ عشق میں خود سپردگی کی لذت وہ جانتے ہی نہ تھے اور یہ ان کے مزاج کا حصہ بھی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عشقیہ شاعری میں عشق کا سوز دروں اور والہانہ جذبات کی گرمی نظر نہیں آتی۔ یہ کمی ایسی ہے کہ اس سے ایک قسم کی تشنگی کو تقویت ملتی ہے۔ جسے مرزا یگانہ نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

بہ قدر ذوق تماشائے حسن ناممکن
ترسنے میں بھی ہے اک کیفیت ترستا جا

شاید اسی لیے تو مجتبیٰ حسین نے کہا ہے کہ انھوں نے حسن کو عاشق کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ وہ اسے ایک ناقد کی نظر سے دیکھتے ہیں، ایسے میں حسن کی پرستش کا تصور کہاں سے آتا کہ وہ تو غور کرنے کی چیز بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس صنف کے سہارے روایتی عشقیہ مضامین کے بدلے حیات و کائنات کے مسائل کو موضوع بنایا اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ وہ رو بہ زوال مغلیہ تہذیب کی آخری نشانیوں میں سے ایک تھے۔ وہ اس ماحول کے خلاف نبرد آزما تھے جس میں تخلیقیت بانجھ ہونے کے کگار پر تھی، جہاں فن کاری کا چرچہ نہ تھا بلکہ ایک قسم کی نقالی اور تقلید کو اہمیت دی جارہی تھی۔ یاس کی کسی بھی غزل پر طائرانہ نگاہ ڈالیے اس میں روایتی غزل کی وہ شان کہیں نظر نہیں آئے گی۔ جس میں واعظ و ناصح، رفیق و رقیب یا محتسب و دربان یا پھر ترک بچہ، اور نحیف و نزار عاشق اپنی گوناگوں موجودگی سے غزل کو ایک خاص نہج پر استوار کرتے نظر آتے ہیں بلکہ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور نظر آئے گا۔ اسے یگانہ کی شاعرانہ انفرادیت اور جرأت فکر ہی قرار دیا جانا چاہیے۔ ایک ایسے ماحول میں ادب و شعر کی آبرو کے لیے سینہ سپر ہوتے رہنا کیا بڑی بات نہیں کہ اس میں ان کا سینہ بھی چھلنی ہوگیا۔ اپنے عہد وسماج کے طور طریقوں کو چیلنج کرنے کا ان کا یہ انداز فاتحانہ یقیناً اہمیت کا حامل ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مرزا یگانہ کی خود پرستی اور غالب شکنی نے ان کی شاعری اور شہرت کو خاصا نقصان پہنچایا لیکن اس امر سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کے اس رجحان نے ہمیں خصوصاً ناقدین غزل کو ایک نئے مزاج سے متعارف کرایا۔ لیکن یہ رنگ ڈھنگ کبھی پر چڑھ نہ سکا یا یوں کہیں کہ وہ اس سے مانوس نہ ہو سکے اور یگانہ کی مزید مخالفت ہونے لگی۔ بقول نیر مسعود:

''یگانہ کی غالب دشمنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی مخالفت جو لکھنؤ تک
محدود تھی اب ہندوستان گیر ہوگئی۔ بعض بہی خواہوں نے انھیں غالب پر
حملے کرنے سے روکا لیکن یگانہ اس سے اور مشتعل ہو گئے۔''[1]

ایسے میں ان کے اہم ترین حلیف بیخود بھی ان سے دور ہوئے ہوں تو کوئی بات نہیں۔ لیکن ایسا صرف غالب شکنی کی وجہ سے ہی نہیں ہوا بلکہ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یگانہ چاہتے تھے کہ بیخود ان کے دست راست بن کر ان کے حریفوں کو ترکی بہ ترکی جواب دیں جو کہ کم از کم بیخود جیسے شاعر سے تو ہرگز ممکن نہیں تھا۔ دیکھیں یہ اقتباس جس سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے۔

''یگانہ اپنے حریفوں کی ضد میں غالب سے برگشتہ ہو گئے تھے۔
۔۔۔انھوں نے غالب اور غالب پرستوں کو بھی نشانہ بنالیا اور اسی زد میں بیخود بھی
آگئے۔ جنھیں انھوں نے غالب کا ''دل چٹا'' مولوی ٹھینگا موہانی اور ''حرصی
ٹٹو'' کے خطاب دینے کے علاوہ ان سے بھی سخت لفظوں میں یاد کیا۔''[2]

خیر یہ ایک الگ قصہ ہے۔ اگر ''یگانہ فہمی'' کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مرزا یگانہ کی شناخت غزل کی بدولت ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ نظم کے مخالف ہیں۔ لیکن غزلوں میں بھی ان کے یہاں وہ تغزل ناپید ہے جس کی بنا پر غزل کو سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ وجہ صرف یہ رہی کہ ان کے یہاں غزل کا وہ جلال و جمال نہیں جو کہ اس صنف کی اہم ترین خوبی ہے بلکہ ان کے یہاں تو صرف ترشی و تلخی ہے تندی و تیزی ہے، نہ اس میں دلبرانہ ادائیں ہیں نہ ہی کوئی ادا شناسی۔ الفاظ و انداز کی سادگی کے باوجود زبان میں جو تختی، بیان میں جو کرختگی اور لہجے میں جو خشونت پائی جاتی ہے وہ ان کی شاعری میں اکھڑپن کی ایک فضا قائم کرتی ہے جس کا تغزل سے کوئی سروکار نہیں۔ ایسے میں غزل کا مترنم اور تاثر سے بھرپور ہونا ممکن ہی نہیں۔ ایک غزل ملاحظہ فرمائیں جو بہت جلد مقبول ہوئی لیکن دیرپا اثر نہیں قائم کر سکی:

قفس میں بوئے مستانہ بھی آئی دردِ سر ہو کر نویدِ ناگہاں پہنچی ہے مرگِ مضطرب ہو کر

1۔ نیر مسعود: یگانہ احوال و آثار، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی 1991 صفحہ 39

2۔ نیر مسعود: یگانہ احوال و آثار، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی 1991 صفحہ 39

نگاہ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دھڑکتا ہے مبادا رنگ و بو اڑ جائے پامال نظر ہو کر
زمانے کی ہوا بدلی، نگاہ آشنا بدلی اٹھے محفل سے سب بے گانۂ شمع سحر ہو کر
کہاں پر نارسائی کی ہے پروانوں کی قسمت نے پڑے ہیں منزل فانوس پر بے بال و پر ہو کر
مقدر اس مسافر کا، طلب جس کی نہیں ہوتی نصیبوں میں ہو گم راہی گنہگار سفر ہو کر
جواب آیا تو کیا آیا؟ صدائے بازگشت آئی دہن سے آہ نکلی مبتدائے بے خبر ہو کر
فلک کو دیکھتا ہوں اور زمیں کو آزماتا ہوں مسافر در وطن، خانہ بدوش رہ گزر ہو کر
عدو کیا زہر دیتا ہے ہم ایسے تلخ کاموں کو؟ لہو کا گھونٹ اتر جاتا ہے جب شیر و شکر ہو کر
خود اپنے خاک و خوں میں لوٹ کر آلودۂ دنیا پڑا ہے اب گڑھے میں گور کے آلودہ تر ہو کر
خدا معلوم اس آغاز کا انجام کیا ہوگا؟ چھڑا ہے ساز ہستی مبتدائے بے خبر ہو کر
دیار بے خودی میں امتیاز روز و شب معلوم بلا آئی ہے بدمستوں پہ شام بے سحر ہو کر
رہائی کا خیال خام ہے یا کان بجتے ہیں اسیرو، بیٹھے کیا ہو گوش بر آواز در ہو کر
مبارک نام آزادی، سلامت دام آزادی دعائیں دوں کسے یارب، اسیر بال و پر ہو کر
عجب کیا وعدۂ فردا پس فردا پہ ٹل جائے کوئی شام اور آ جائے نہ شام بے سحر ہو کر
نگاہ یاس کا عالم جو آگے تھا سو اب بھی ہے ہزاروں گل کھلے بازیچۂ شام و سحر ہو کر

چہ جائیکہ یہ غزل یگانہ کی طویل ترین غزلوں میں شمار کی جاتی ہے لیکن کلیم الدین احمد جیسے سخت ترین ناقد نے بھی اس کی تعریف کی اور کہا کہ ان اشعار سے سامعہ اور دماغ پر خوش گوار اثر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے لیے جواز قائم کرتے ہوئے وہ بجا طور پر فرماتے ہیں کہ ان کی شاعری میں خیال کی بلندی، فکر کی ندرت، مشاہدے کی گہرائی، الفاظ کے سہی انتخاب، روزمرہ اور محاورات کے فن کارانہ استعمال، بندش کی چستی، ہندی الفاظ کے تخلیقی صرف، فارسی تراکیب کی معنی خیزی، تشبیہات کی تازگی اور تصرفات کی دلکشی سبھی کچھ موجود ہے۔ لیکن چونکہ کلیم صاحب فن غزل گوئی کے ہی مخالف ہیں اس لیے فوراً ہی اپنی بات سے پھر جاتے ہیں اور اس پر منفی تنقید سے گریز نہیں کرتے کہ یہ اثر گہرا نہیں ہوتا، فوراً مٹ جاتا ہے یا یہ کہ ان شعروں میں وہ تاثیر نہیں جو گریباں گیر ہو جائے وغیرہ وغیرہ۔ ان کی یہ باتیں سچ سے قریب تر ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ اس غزل میں مندرجہ تمام خوبیوں

کے باوجود بھی کچھ کمی سی ہے یا پھران کا یہ کہنا کہ ان کی شاعری میں شاعری کی سوا اور سبھی کچھ ہے۔صرف ایک تنقیدی جملہ نہیں،اسے تاثر کی سطح پر قائم کیا گیا جملہ کہا جا سکتا ہے۔اگرایسا انھوں نے اس لیے کہا کہ ان اشعار میں لہجہ کا وہ اظہار نہیں جوابدیت کی نشانی قرار دی جا سکے جیسا کہ میر، غالب اور مومن کے کلام میں موجود ہے۔تو اسے کوئی بھی ذہین قاری صدفی صد درست مانے گا اور اسے بہ سروچشم قبول کرے گا لیکن یاس یگانہ چنگیزی کی غزل گوئی کے مزاج کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے اس بات پر نگاہ رکھنا بھی ضروری ہے کہ یگانہ کی غزل بیسویں صدی کی غزل ہے اسے نئی غزل کی ایک نئی آواز کے تناظر میں سمجھنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے ورنہ نتائج ویسے ہی برآمد ہونگے جیسا کہ یگانہ کے دیگر ناقدین نے برآمد کیے ہیں۔یاس یگانہ کی شاعری پر اس قدر تفصیلی گفتگو کے بعد اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری ایک نئے عنوان بلکہ ایک نئے امکان کی شاعری ہے جس پر انھوں نے بارہا اصرار کیا ہے۔ان کا شمار اردو کے ان شعرا میں کیا جانا چاہیے جنھوں نے اردو شاعری کو حکیمانہ ذہن اور فلسفیانہ مزاج عطا کیا ہے ان کی شاعری نہ تو بوس وکنار کی آویزش کا نام ہے نہ ہی عشق میں ناکامی کا نوحہ۔ہاں!اسے خود پرستی اور آپ بیتی کہا جا سکتا ہے،ایسی آپ بیتی جو زندگی کرنے کا،اس سے نبرد آزما ہونے کا ہنر سکھاتی ہے،اسے برتنے اور سمجھنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔اس بات سے تمام اہل نظر واقف ہیں کہ یگانہ کو آتش سے حد درجہ انسیت تھی بلکہ وہ تو خود کو ''آتش پرست'' بھی کہا کرتے تھے۔آتش پرست کہنا صرف شاعری کی حد تک نہیں،اسے مذہب بیزاری پر بھی محمول کر کے دیکھا جا سکتا ہے کہ مذہبی خانوادے میں پیدا ہوتے ہوئے بھی اس سے بیزاری ان کی سرشت میں شامل تھا۔آتش اور یگانہ کے مزاج اور کلام میں بھی کئی سطحوں پر مشابہت نظر آتی ہے۔اسی لیے ان کی شاعری میں بھی اکڑ،بانکپن،بے فکری پائی جاتی ہے لیکن ان کے یہاں نہ آتش کی طرح کا تصوف ہے نہ ہی کسی قسم کی رندی،سرمستی و بے خودی کا عالم پایا جاتا ہے۔اگر چہ آتش کے یہاں تصوف کے بین بین بادہ وساغر کی بات بھی پائی جاتی ہے،اور اس میں ایک قلندرانہ شان بھی نظر آتی ہے۔لیکن یگانہ کے یہاں ایسا کچھ بھی نہیں،اس کی اہم وجہ وہی ہے کہ ان کے یہاں انفعالی رومانیت اور عشقیہ شاعری کا فقدان ہے۔ہاں ان کے یہاں راحت طلبی کے بجائے سخت کوشی کا جذبہ ہر جا موجزن ہے جسے ذوق تصادم نے جلا بخشا ہے۔بطور ثبوت

یہ اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔

ٹکرا کے دیکھیں تم کیا ہو ہم کیا ہیں
جیتے تو جیتے ہارے تو ہارے

مرا دشمن خود اپنی موت، تو نے تو نہیں مارا
کوئی مردِ عمل جھوٹی خوشی پر شاداں کیوں ہو

ریاضت سے جو حاصل وہی سچی مسرت ہے
میسر آسکے صاحب تو ان داموں گراں کیوں ہو

لہو لگا کہ شہیدوں میں ہو گئے داخل
ہوس تو نکلی مگر حوصلہ کہاں نکلا

مزا جب ہے کہ رفتہ رفتہ امیدیں پھلیں پھولیں
مگر نازل کوئی فضل الٰہی ناگہاں کیوں ہو

اردو تنقید کی دنیا میں مجنوں گورکھپوری واحد نام ایسا ہے جس نے ''یگانہ تنقید'' کو اس وقت جلا بخشا جب ناقدین لکھنؤ کے علاوہ دہلی، لاہور یا علی گڑھ کے نامی گرامی ناقدین ادب ان سے نالاں تھے بلکہ یہ کہا جائے کہ مجنوں نے اس وقت ان کا ساتھ دیا ان کی شناخت قائم کرنے کی کوشش کی جب پوری ادبی دنیا ان سے بیزار تھی۔ اس امر کا ذکر پہلے کیا جاچکا کہ انھیں کئی ناقدین نے شاعر ہی نہ گردانا کہ یہ سب خود یگانہ کا ہی کیا دھرا تھا۔ وہ تو ان کا اعتماد اور خود کو منوانے کا جذبہ تھا کہ وہ کسی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے اور موقع بہ موقع خود کو ثابت بھی کرتے رہے۔ یہ ان کی شخصیت کی توانائی اور کلام کی کاٹ تھی کہ وہ رد نہ کیے جاسکے ورنہ جس کے پیچھے پورا ادبی گروہ ہاتھ دھو کر پڑا ہو آج اس کا نام لیوا کون ہوتا۔ یہاں ان کے اکلوتے مداح مجنوں گورکھپوری کا ایک خیال درج کرتے چلیں کہ جس میں انھوں نے یگانہ کی ذہنی تشکیل میں میر غالب اور آتش کو اہم گردانا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ کہ یگانہ کو صرف ان شعرا نے یگانہ بنایا ہو ممکن نہیں۔ اس خیال سے حتمی طور پر اتفاق نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یاس یگانہ نے اپنے متقدمین میں سے

نہ جانے کس کس سے کتنا اثر قبول کیا۔ اگر یگانہ کو اس نظریہ سے بھی دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ خود کو میر، غالب اور آتش کے علاوہ سودا، انیس اور اکبر کا بھی عقیدت مند گردانتے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان کی تشکیل میں حافظ، سعدی، عرفی، بیدل وصائب وغیرہ کا بھی ہاتھ رہا ہے، حق بجانب ہے۔ بقول بلند اقبال بیگم وہ تو بیدل وصائب کے دیوان سفر وحضر ہر جگہ ساتھ رکھتے تھے۔ جہاں تک میرے نقطۂ نظر کا سوال ہے ان سب باتوں کو محض عقیدت ہی سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ انھوں نے ان شعرا سے ویسا کچھ نہیں اخذ کیا جس سے ان کی شاعری ضوفشاں ہو جائے، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ تھوڑے بہت اثرات دکھائی دیتے ہیں وہ سب کے سب ان میں موجود تھے، ہاں اسے مہمیز دینے میں کسی نے کوئی کردار ادا کیا ہو تو، کیا ہو، اس سے انکار بھی نہیں۔ انھوں نے عموماً کسی سے کچھ بھی استفادہ نہیں کیا ہے اس کا ثبوت کچھ یوں فراہم ہو جاتا ہے کہ اگر انھوں نے طنز کی کاٹ اکبرالہ آبادی سے لی، تو ایسا صرف اس لیے ہو سکا کہ ان کے حالات ہی ایسے تھے کہ وہ اس قسم کی شاعری کرنے لگے، جہاں تک سودا کی بلند آہنگی کا سوال ہے جو کہ ان میں بھی تھی تو یہ کہنا جائز اس لیے نہیں کہ اگر ان کی شاعری میں بلند آہنگی نہ ہوتی تو وہ اپنے مدمقابل شعرا کو کیوں کر جواب دے پاتے۔ اگر میر کے انداز بیان کی بھی بات کی جائے تو یگانہ کے کلام میں ان کے حالات کی بدولت ہی یہ رخ پیدا ہوا تھا، اسی طرح غالب کی انانیت اور خود پرستی اور مذہب بیزاری وغیرہ سے اثر قبول کرنے کی بات بھی کوئی جواز نہیں رکھتی کہ وہ تو پیدائشی طور پر ایسے ہی تھے، کہ جو بات سچ لگی اور پچ گئی ڈنکے کی چوٹ پر کہہ ڈالی کہ اسے کوئی انانیت پسندی قرار دے یا خود پرستی یا پھر اسے ان کی مذہب بیزاری ہی کیوں نہ سمجھا جائے۔ لہجے کی یہی کاٹ، یہی بانکپن تو یگانہ کو یگانہ بناتا ہے۔ بقول مرزا یگانہ چنگیزی۔

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
آہ کس دن کے لئے ناحق پرستی کیجئے

یہ تمام باتیں اپنی جگہ، لیکن جہاں تک غالب و میر و آتش کے اسلوب نگارش کا سوال ہے وہ بھی ان کے یہاں مفقود نہیں۔ اگر ان شعرا کے معیار کے مطابق اشعار تلاش کیے جائیں تو یگانہ کے یہاں ایسے دو چار اشعار یقیناً مل ہی جائیں گے کیا اسی بنا پر ہم انھیں ان

شعرا کا مقلد مان لیں۔ اسی طرح یہ کہنا کہ ان پر میر کے اثرات تھے یعنی دردمندی اور سوز و گداز تو ان کی شاعری سے سرسری گزر جایئے کہیں بھی ویسا احساس نہیں ملے گا جو کہ میر کے یہاں جابجا نظر آتا ہے۔ اس معاملے میں بھی انداز یگانہ ذرا منفرد ہے۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے انھوں نے شاد سے ضرور اثر قبول کیا ہے کہ وہ جب شعر گوئی کی طرف راغب ہوئے تو ان کے اولین استاد شاد کے شاگرد بیتاب تھے اور پھر دو چار غزلوں تک ہی سہی شاد بھی ان کے استاد قرار پائے۔ ان کی شاعری میں جوانا نیت، طنطنہ اور تیور نظر آتا ہے اسے حضرت شاد کا مرہون منت قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بلکہ زبان و بیان اور لب و لہجے کے اعتبار سے بھی غور کیا جائے تو وہ شاد سے قریب تر نظر آتے ہیں۔ اس میں ان کی پرورش و پرداخت کا بھی اہم حصہ ہے۔

مرزا یگانہ بھی شاد کی ہی طرح خود احتسابی کے شکار ہیں اور انھیں اس بات کا شدید ترین احساس ہے کہ ان کے ساتھ زمانے نے وہ سلوک نہ کیا جس کے وہ مستحق تھے۔ کہاں تو انھیں یہ توقع تھی کہ زمانہ ان کی ایسی قدر کرتا کہ دنیا عش عش کرتی، انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا لیکن اس کے برخلاف ان کی تقدیر ایسی کھوٹی نکلی کہ انھیں تعصب، تنگ نظری، تضحیک و توہین اور بے اعتنائی کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسا نہیں کہ یہ کوئی پہلا واقعہ تھا کیونکہ ایسا تو اہل ہنر کے ساتھ اکثر ہوا کرتا ہے۔ غالب ہی کو لیجیے کہ ان جیسے عظیم شاعر کو بھی لوگوں نے گالیاں لکھ بھیجیں لیکن وہ ان کا انداز ''غالبانہ'' تھا کہ انھوں نے دشنام طرازی کو بھی ہنسی ہنسی میں اڑا دیا، اور گالی گلوچ کرنے والے پر یہ پھبتی کسی کہ افسوس اسے گالی دینا بھی نہ آیا کہ بوڑھوں کو اس کی ماں بہن کی گالی نہیں دیتے، زندگی کی تلخیوں کو نہایت خندہ پیشانی سے گوارا بنا لینا سب کے بس کی بات نہیں چہ جائیکہ یگانہ، جن کے یہاں انتقامی جذبہ اپنے عروج پر تھا۔ یگانہ اس پورے عمل میں بیگانہ بن کر جداگانہ انداز نہ اختیار کر سکے۔ ان سے یہ سب نہ ہو سکا کہ ان کی ذات میں اتنا صبر و تحمل نہیں تھا اور وہ دو دو ہاتھ کرنے پر اتر آئے، چنگیزی پینترے دکھانے شروع کیے۔ یہ ان کی چنگیزیت ہی کہی جائے گی کہ وہ معاف کرنا یا عفو و درگزر کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ شاید اس میں انھیں اپنی ہتک محسوس ہوتی تھی یا یہاں احساس شکست و ناکامی غالب تھا۔ اسی انتقامی جذبے نے ان کو بھی خوب چوٹ پہنچائی، چوٹوں پر چوٹیں کھانا اور اسے سہارتے رہنا، یہ بھی بڑے حوصلے کی بات ہے بقول ان کے ''جو غم بھی کھائیں تو

پہلے کھلائیں دشمن کو"۔ علم نفسیات کے ماہرین کی نظر میں یہ ایک قسم کی ایذا رسانی ہے یا ایذا طلبی کہ جس میں ایذا پسندی کا عنصر خود بخود در آتا ہے۔ میری نظر میں اس کام و دہن کی آزمائش میں ان کا انداز بیان بگڑا تو بگڑا ہی بقول انہی کہ "غم کھاتے کھاتے منہ کا مزا بھی بگڑ گیا" اور یہ سب احتجاج و انتقام کے جذبے کا کمال تھا کہ انھیں شاید یہ احساس ہی نہیں ہو سکا کہ ٹھوکر لگاتے وقت خود کو بھی چوٹ لگتی ہے، ظاہر ہے ہر عمل کا ردعمل تو ہوتا ہی ہے۔ دیکھیں ان کی اسی ذہنیت کے غماز یہ اشعار۔

یگانہ میر وہی ہے جو پہلے مار چلے
جو ٹھن گئی ہے تو اب تاب انتظار نہیں
عجیب کیا ہے ہم ایسے گرم رفتاروں کی ٹھوکر سے
زمانے کے بلند و پست کا ہموار ہوجانا
علاج اہل حسد زہر خند مردانہ
ہنسی ہنسی میں تو ان احمقوں کو ڈستا جا
میں کہاں اور کہاں کے پست و بلند
ایک ٹھوکر میں تھا بکھیڑا پاک
جفائے پنجہ خونخوار سے جو بس نہ چلے
تو بن کہ خشک نوالہ گلے میں پھنستا جا

کیا ان اشعار میں ایک خاص قسم کا ردعمل نظر نہیں آتا۔ یقیناً ایسا ہی ہے، مرزا یگانہ میں مفاہمت، عاقبت اندیشی اور صلح جوئی جیسی صفات تھیں ہی نہیں۔ شاید اسی لیے وہ اپنے زمانے کے کھرے بلکہ کھردرے شخص قرار پائے۔ اسی کھردرے پن نے ان کے دشمنوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ کیا اور دوستوں کی تعداد قلیل ترین ہوتی چلی گئی، نتیجتاً وہ غار تنہائی میں ڈوبتے چلے گئے لیکن وہ بھی اپنی دھن کے پکے تھے۔ خواہ نتائج ان کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں انھیں تو اپنی روش پر ہی ثابت قدم رہنا تھا اور وہ رہے۔ بقول شاعر۔

چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے
میں کہاں ہار ماننے والا

یا پھر یہ شعر۔

نہ خداؤں کا نہ خدا کا ڈر، اسے عیب جانئے یا ہنر
وہی بات آئی زبان پر جو نظر پہ چڑھ کے کھری رہی

یہ شعر اسی شخص کے نوک قلم کی زینت بن سکتا ہے جس کی زندگی شدید تنہائی اور اذیت میں گزر رہی ہو لیکن اس میں بھی ایک رجائی پہلو پوشیدہ ہے یہاں فانی کی قنوطیت کا گزر نہیں، راہ فرار کا شائبہ بھی نہیں جو کہ اصغر کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے بلکہ ایک عجیب سا بانکپن ہے کہ میں کہاں ہار ماننے والا۔ یہاں ایک چیلنج بھی پوشیدہ ہے کہ انھیں لگی لپٹی نہیں آتی، وہی بات زیب دیتی ہے جو سو فیصد کھری ہو۔ ایسا صرف یگانہ جیسا ہی کوئی شاعر کر سکتا ہے۔ دیکھیں اسی قسم کا یہ شعر۔

مزے کے ساتھ ہوں اندوہ غم تو کیا کہنا
یقیں نہ ہو تو کرے کوئی امتحاں میرا

ظاہر ہے اس قسم کی ذہنیت والا آدمی فرار سے کوسوں دور رہتا ہے ورنہ کوئی عام آدمی تو ان حالات میں موت کی تمنا کرنے لگتا یا پھر خودکشی ہی کر لیتا لیکن یگانہ ان سب کے باوجود بھی دنیا کی دلکشی کا رس نچوڑ لینے پر آمادہ تھے۔ بقول یگانہ۔

دنیا سے یاس جانے کو جی چاہتا نہیں
واللہ کیا کشش ہے اس اجڑے دیار میں

غضب کی دھوم شبستان روزگار میں ہے
کشش بلا کی تماشائے ناگوار میں ہے

دو رباعیاں پیش کی جاتی ہیں جن میں دنیا کے متعلق ان کے مشاہدات کا نہایت عمدہ بیان ہے۔

جس باگ پہ چاہے موڑتی ہے دنیا
کستی ہے کبھی جھنجھوڑتی ہے دنیا
پائے ہمت کو توڑتی ہے دنیا
نامرد بنا کہ چھوڑتی ہے دنیا

واللہ یہ دنیا بھی عجب دنیا ہے
ہر رنگ میں وہ کشش کہ دل کھنچتا ہے
منہ بولتی، جیتی جاگتی تصویریں!
اعجاز ہنر ہے یا کوئی دھوکا ہے؟

مرزا یگانہ کی پوری شاعری مونولاگ پر مبنی شاعری ہے یہاں ڈائیلاگ بہت کم پایا جاتا ہے۔ان کے اہم موضوعات وجود خدا، دنیا، بے ثباتی دنیا اور انسان کا مجبور محض ہونا وغیرہ ہے جس پر وہ بار بار اظہار خیال کرتے ہیں۔اسی سے ان کے عقیدے کی غمازی بھی ہوتی ہے ۔اس میں تشکیک کو بھی اہم مقام حاصل ہے یہی وہ شے ہے جو انھیں کبھی لا ادریت کی طرف ڈھکیل دیتی ہے تو کبھی کفر و الحاد کی جانب۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تصور خدا کو بھی انسان کا تخلیق کردہ تصور مانتے ہیں،اور مذہب کو بھی۔ایسا اس لیے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان نے اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے یہ تصور تراش لیا ہے،اس لیے مذہب اور تصور خدا بے سود ہے۔کیونکہ اسی کے نام پر امن عالم کو تہ و بالا کیا جاتا ہے۔ان کے خیال میں انسان دنیاوی مسائل میں ہی اس قدر الجھا ہوا ہے، حیران و پریشان ہے کہ اس پر دینی فرائض عائد کر دینا مناسب نہیں۔ان کی نظر میں پیمبروں اور اہل نظر میں کوئی فرق نہیں بعینہ ویسے ہی جیسا کہ آب زم زم اور آب رود گنگا میں۔ایک نظریے کے تحت اگر دیکھا جائے تو عقیدتاً دونوں ہی تطہیر کے کام ہی آتی ہیں۔ان کی نظر میں تطہیر نفس ضروری ہے ورنہ سب بے سود۔دیکھیں چند اشعار جن میں کچھ اسی قسم کی بازگشت سنائی پڑتی ہے۔

خدا کے سامنے پاکیزگی جتانا کیا
نگاہ پاک ہو،دل صاف ہو ،وضو نہ سہی
نکل ہی جاتا ہے مطلب تری قسم کھا کر
تو بندگان ضرورت کا آفریدہ سہی
قیامت تک یہ کالے کوس روشن ہو نہیں سکتے
عبث ہے ہمرکاب کافر و دیں دار ہو جانا

وہ کیوں سر کھپائے تری جستجو میں
جو انجام فکر رسا جانتا ہے

کیسے کیسے خدا بنا ڈالے
کھیل بندے کا ہے خدا کیا ہے
کون جانے ندائے حق کیا ہے؟
کس خدا کی زبان میں آئی؟

ایک جھلک ہی دکھلا دے تو دور سے جھک کے سلام کروں
اس پار جگت کے ہوگا کوئی، اس پار نہیں تو کچھ بھی نہیں

حسن بے تماشہ کی دھوم کیا معمہ ہے
کان بھی ہے نامحرم آنکھ بھی ترستی ہے
آندھیاں رکیں کیوں کر زلزلے تھمیں کیوں کر
کارگاہ فطرت میں پاسبانی رب کیا

نہا لیتے گنگا، بکھیڑا تھا پاک!
گناہوں کو زم زم سے دھویا تو کیا
صلح ٹھہری تو ہے برہمن سے
کہیں مذہب اڑا نہ دے کوئی ٹانگ

میں پیمبر نہیں یگانہ سہی
اس سے کیا کسر شان میں آئی
دنیا کے ساتھ دین کی بیگار، الاماں
انسان آدمی نہ ہوا جانور ہوا

پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا
خدا تھے اتنے مگر آڑے آ یا نہ گیا

یہ بھی اشعار ان کی فکر کے آئینہ دار ہیں جس میں تشکیک، الحاد اور لاادریت کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود یہ کہنا ہی پڑے گا کہ ان میں خدا کا ایقان اور ایمان بھی پوشیدہ تھا۔ جبھی تو مرتے وقت انھوں نے ان تین لوگوں سے اس بات کا اقرار کرا لیا تھا جو دم آخر ان کے پاس موجود تھے۔ چونکہ مرزا یگانہ تمام عمر تضادات کے شکار رہے، اس لیے بھی یہ سبھی باتیں ان سے وابستہ ہو کر رہ گئیں اور وہ اپنے زعم ناقص میں انھیں محسوس تک نہ کر سکے۔

اردو ادب میں غزل کے لغوی معنی محبوب یا پھر عورتوں سے متعلق بات کرنا ہے مدعا یہ کہ اس میں عشقیہ مضامین کی بھر مار ہوا کرتی ہے لیکن یاس یگانہ ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اس صنف سخن کو ایک نئے نقطۂ نظر سے دیکھا، اس کی ایک الگ ہی تعریف پیش کی وہ اپنی تصنیف ''غالب شکن'' میں لکھتے ہیں:

> ''غزل گوئی محض مرد و عورت کے جنسی تعلقات یا عاشقانہ زندگی کی ترجمانی کا نام نہیں بلکہ یہ وہ مشکل ترین صنف ہے جس میں زندگی کے بڑے بڑے اہم مسائل اختصار و جامعیت کے ساتھ بیان کرنے میں اعلیٰ درجہ کی شاعرانہ قوتیں صرف ہوئی ہیں۔''[1]

یہ ہے غزل کے تئیں ان کی منفرد سوچ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ وہ اپنی انانیت، خود پسندی اور خود پرستی کے زعم میں اس میدان میں کوئی کارہائے نمایاں انجام نہیں دے پائے، ظاہر ہے ایسے مزاج کا حامل شخص عشقیہ شاعری کر بھی کیسے سکتا ہے یہ ان کے بس کی بات بھی نہ تھی کہ وہ تو تمام عمر حسن ذاتی کی جھلک کے متلاشی رہے۔ جبھی تو انھوں نے کہا تھا۔

یہ بلائے حسن کہاں نہیں مگر اپنے واسطے قحط حسن
تمہیں کیا بتائیں نظر کے ساتھ جو وقت نظری رہی

یا پھر یہ اشعار۔

1۔ مرزا یگانہ: غالب شکن (دو آتشہ) صفحہ 7

مجھ سے معنی شناس پر جادو
حسن صورت حرام کیا کرتا

محبت کا مزہ بگڑا کہ نیت بھر گئی اپنی
طبیعت جانے کیوں تلخی پہ مائل ہوتی جاتی ہے

عشق ہی عین زندگی تو نہیں
ہاں مگر زندگی کا آلہ کار

ان اشعار سے مرزا یگانہ کے تجربات کی غمازی تو ہوتی ہی ہے۔ اسے پہلی نظر میں شاید محبت میں مایوسی کا شاخسانہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ دل کے معاملات میں ان سے کبھی کوئی لغزش نہ ہو سکی کہ ان کا ''محور عشق'' تو لکھنؤ اور وہ لکھنوی حسن تھا جو ان ہی کے گھر کی چہار دیواری میں ان کا منتظر رہا کرتا تھا۔ تلاش کرنے پر اسی قسم کے چند تجربات ان کی عشقیہ شاعری میں اور مل جائیں گے جہاں وہ حسن کو لتاڑتے ہیں اور اس کی بدگوئی کو ہی اپنا شیوہ قرار دیتے ہیں۔

بتاؤں کیا تمھیں بازار کا اتار چڑھاؤ
بنا رہے گا یہی بھاؤ دن ڈھلے کیوں کر

نشۂ حسن کو اس طرح اترتے دیکھا
عیب پر اپنے کوئی جیسے پشیماں ہو جائے

مرزا یگانہ کے ان اشعار سے ایک بات تو واضح ہوگئی کہ وہ اس میدان کے آدمی تھے ہی نہیں ورنہ وہ اس قسم کے اوچھے مشورے ہرگز نہ دیتے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس میں زندگیاں برباد ہوتی ہیں تو سنورتی بھی ہیں، یہ تو اپنے اپنے ظرف پر منحصر ہے کہ کس کے مقدر میں کیا ہے یا کس نے اس سے کیا کشید کیا۔ ان کے یہاں صرف زندگی کو اولیت حاصل ہے شاید اسی لیے حسن و عشق دونوں ہی کے تئیں ان کا رویہ حقارت آمیز ہے۔ چونکہ یگانہ اس جذبے کے حصار میں نہیں آسکے، اس لیے انھیں کیسے معلوم ہوتا کہ اس میں کس قسم کا والہانہ پن پایا جاتا ہے کیسی خود سپردگی پائی جاتی ہے، اور اس سے کس قدر جمالیاتی احساس پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔ شاید یہی

وجہ ہے کہ یگانہ نے حسن وعشق کو اپنی شاعری کا موضوع ہی نہیں بنایا۔ ان کے یہاں یہ معاملہ مضمون آفرینی کی حدوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ملاحظہ فرمائیں چند اشعار جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ ان کے یہاں اس کا کس قدر فقدان ہے۔

لاش کمبخت کی کعبہ میں کوئی پھنکوا دے
کوچۂ یار میں کیوں ڈھیر ہو بیگا نے کا

بس ایک سایۂ دیوار یار کیا کم ہے
اٹھا لے سر سے میرے سایہ آسماں اپنا

توبہ بھی بھول گئے عشق میں وہ مار پڑی
ایسے اوسان گئے ہیں کہ خدا یاد نہیں

کعبہ نہیں کہ ساری خدائی کو دخل ہو
دل میں سوائے یار کسی کا گزر نہیں

سر شوریدہ کجا عشق کی بیگار کجا
مگر اللہ رے دل آپ کے دیوانے کا

تو حسن کا ہے دیوتا عشق کا پیمبر
دیکھے تو کون اپنے سانچہ میں ڈھالتا ہے

کیا عجب ہے جو حسینوں کی نظر لگ جائے
خون ہلکا ہے بہت آپ کے دیوانے کا

عشق کا حسن طلب اک معنیٔ بے لفظ ہے
ٹکٹکی بندھ جائے گی مطلب ادا ہو جائے گا

مرزا یگانہ کے یہ اشعار کس جانب اشارہ کرتے ہیں صرف اسی جانب کہ عشق کا حسن طلب اک معنی بے لفظ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسا خیال صرف وہی شخص پیش کرسکتا ہے جس کا مزاج عشقیہ جذبات سے عاری ہو، جو اس دور سے گزرا ہی نہ ہو یا پھر اسے محبت میں مایوسی کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ لگا ہو۔ یا پھر ایسے خیالات ایک بالغ نظر شخص کے بھی ہو سکتے ہیں۔ جس کے یہاں عشق کا ایک صاف ستھرا اور نکھرا ہوا بلکہ پاک جذبہ پوشیدہ ہو۔ جس میں ہجر و وصال کی آرزو یا اس کے متعلقات سے اجتناب برتنے کو اہمیت دی گئی ہو۔ دیکھیں یہ اقتباس جس سے میرا مطمح نظر مزید واضح ہو سکے گا۔

> ''یگانہ میں جھنجلاہٹ، تنگ نظری، اکڑفوں غصہ خشک مزاجی تو نظر آتی ہے لیکن نابالغ عشقیہ جذبات کی میٹھی گولیوں سے ان کا کلام یکسر عاری ہے۔ یگانہ غزل کے تقریباً پہلے شاعر ہیں جن کا مزاج عشقیہ نہیں ہے۔ عشقیہ مرکز کی اس غیر موجودگی نے اگرچہ ان کے کلام سے خوش گواری چھین لی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ خود ترحمی اور ڈھیلے ڈھیلے نیم گرم آنسوؤں کے فقدان، ہجر و وصال کے زنانہ چونچلوں اور محبوب کو اپنے برابر کا، اپنی طرح کا انسان کے علاوہ سب کچھ سمجھنے کے رجحان ان کے کلام کی پاکی، انھیں یقیناً ہمارے عہد کے لیے حسرت، اصغر، عزیز، صفی بلکہ فانی اور جگر سے بھی زیادہ قابل مطالعہ بناتی ہے۔''[1]

آیئے اب ذرا میرزا یگانہ کی شاعری کا اسلوبیاتی مطالعہ کیا جائے۔ اس سے ہمیں یہ معلوم ہو سکے گا کہ آیا ان کا انداز استادانہ تھا یا نہیں نیز یہ بھی کہ ان کے یہاں فکر کی پختگی بھی پائی جاتی تھی کہ نہیں۔ میری نظر میں ان کے لیے دونوں ہی باتیں حق بجانب ہیں استادانہ اس لیے کہ انھیں اساتذۂ فن سے خاص شغف ہے اور انھوں نے وہی نہج اختیار کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ ان کے یہاں فکر کی پختگی کچھ یوں تھی کہ وہ کثیر المطالعہ شخص تھے جس کو ان کے تجربات و مشاہدات نے صیقل کر دیا تھا۔ شاید اسی بنا پر ان کے سلسلہ میں یہ غلط فہمی رائج ہو گئی کہ ان کا اسلوب قدیم ہے۔ جبکہ ایسا

---

1. بحوالہ مجتبیٰ حسین: مقدمہ، یگانہ (مرتبہ: ساحل احمد) صفحہ 297

نہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اسے قدیم نہ کہہ کر کلاسیکی کہا جانا چاہیے۔ کیونکہ ان کی شاعری میں، ان کے اسلوب میں جو سفاکیت، صفائی، تندی و تیزی ہے اس سے قدیم شاعری کا کوئی لینا دینا نہیں۔ ایسا اس لیے بھی کہ انھوں نے ایسے بے شمار الفاظ اور محاورات استعمال کیے ہیں جن کا قدیم شاعری سے کوئی لینا دینا نہیں بلکہ اکثر الفاظ و محاورات اور تراکیب تو غزل کے مزاج سے بھی مناسبت نہیں رکھتے۔ لیکن یہ بھی ان کی فن کاری ہے کہ انھوں نے ان کا ایسا برمحل استعمال کیا ہے کہ یہ سبھی لطف سے خالی نظر نہیں آتے۔ اسی بنا پر وہ ان الفاظ و محاورات کے استعمال کو ہنر گردانتے ہیں اور اس کے گن گان سے بھی نہیں چوکتے۔ شاعری کے متعلق ان کی سوچ کا غماز ان کا یہ قول جس میں وہ کہتے ہیں کہ کسی بات کو سیدھی سادی ترکیبوں سے ایسے بیان کر دینا کہ مطلب سمجھ میں آ جائے یا پھر اسی بات کو کسی پاکیزہ محاورے، کسی خاص بانکپن، کسی نرالے انداز سے یوں بیان کر دینا، یا کوئی ایسی آڑی کن لگا دینا کہ دل بے چین ہو جائے، نہ صرف معنی خیز ہے بلکہ اہمیت کا حامل بھی ہے۔

ایک طرف تو مرزا یگانہ اس طرز فکر کے داعی اور مداح ہیں تو دوسری طرف ان کے معترضین اس قسم کی شاعری کو فن کی کمزوری قرار دیتے نہیں تھکتے۔ ظاہر ہے اس انداز فکر نے کیا کیا گل نہ کھلائے، اس سے ادبی دنیا کے باذوق قاری بخوبی آشنا ہیں۔ بہر حال ان کی شاعرانہ انفرادیت کے تمام پہلوؤں میں ایک اہم پہلو زبان و بیان کا خلاقانہ استعمال تو ہے ہی وہ اسلوب بھی ہے جو مرزا محمد رفیع سودا کے انداز کی یاد دلاتا ہے، شاید اسی کا مرہون منت بھی ہو۔ جبھی تو شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی ان کے متعلق اس بات پر اصرار کیا ہے کہ:

> ''انھوں نے غزل کے سرمائے سے ایسے الفاظ کو کم کرنے کی کوشش کی جو اردو غزل کی دونوں روایتوں میں مشترک تھے، جنھیں ترقی پسندوں نے بھی مسترد نہیں کیا تھا، لیکن جو اپنی معنویت کھو چکے تھے ان کے اخراج کی کوشش کی، لیکن وہ نئے الفاظ غزل میں نہ داخل کر پائے۔ چنانچہ ان کی دنیا سکڑی ہوئی اور بے رنگ معلوم ہوتی ہے۔''[1]

اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ اس میدان میں ناکام ہی رہے بلکہ انھوں نے اس کی

---

1. بحوالہ، مجتبیٰ حسین: مقدمہ، یگانہ (مرتبہ: ساحل احمد) صفحہ 297

بھرپائی اپنے اس عمل سے کردی جس کے تحت ان شاعرانہ موضوعات کو مسترد کرنا تھا جو زمانہ قدیم سے چلے آرہے تھے اور کوئی اسے چیلنج کرنے والا بھی نہیں تھا۔ یگانہ نے بارہا اپنی افتادِ طبع اور خلاقی سے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی موضوع، موضوعِ شعر بن سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں مواد اور اسلوب دونوں سطح پر ایک عجیب سی انفرادیت جلوہ گر ہے۔ جبھی تو ان کے کئی اشعار ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں اور آج بھی زباں زدِ خاص و عام ہیں۔

لہو لگا کے شہیدوں میں ہو گئے داخل
ہوس تو نکلی، مگر حوصلہ کہاں نکلا

عجب کیا وعدۂ فردا، پس فردا پہ ٹل جائے
کوئی شام اور آ جائے نہ شام بے سحر ہو کر

اٹھو اے سونے والو سر پہ دھوپ آئی قیامت کی
کہیں یہ دن نہ ڈھل جائے نصیب دشمناں ہو کر

علم کیا علم کی حقیقت کیا
جیسی جس کے گمان میں آئے

کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی
کسی کے زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

کلمہ پڑھو تو کیوں پڑھو سب کی نظر میں کیوں چڑھو
یادِ خدا تو دل سے ہے، دل سے زباں تک آئے کیوں

جواب دے کہ نہ توڑو کسی غریب کا دل
کوئی بلا سے سراپا امید وار رہے

باز آ ساحل پہ غوطے کھانے والے باز آ
ڈوب مرنے کا مزہ دریائے بے ساحل میں ہے

برابر بیٹھنے والے بھی کتنے دور تھے دل سے
مرا ماتھا جبھی ٹھنکا فریب رنگ محفل سے

یگانہ وار ایک ہی رخ سے نہ دیکھئے
دنیا کے ہر مشاہدۂ ناگوار کو

سچ تو یہ ہے کہ اردو شعر و ادب کی دنیا میں وہ ایک نئی زبان کے موجد ہیں ۔نئی زبان یوں کہ ان کے یہاں کئی رنگ لیے ہوئے، پہلودار اور کئی قسم کے انداز سے مالا مال اشعار نظر آئیں گے ۔ بہ غور توجہ کی جائے تو ہماری نظر پہلے پہل ویسے اشعار پر جاتی ہے جن میں فارسی دانی کی جھلک ملتی ہے۔ان میں نہایت عمدہ اور معنی خیز ترکیبیں ایک سماں باندھنے کا کام کرتی ہیں۔ملاحظہ فرمائیں چند اشعار جو ان کی انہی خوبیوں کی جانب ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں۔

فلک کو دیکھتا ہوں اور زمیں کو آزماتا ہوں
مسافر در وطن خانہ بدوش رہ گزر ہو کر

زمانے بھر کا منہ تکتے ہیں کیوں اپنی طرف دیکھیں
بسر کرنا ہے جن کو رنگ و بوئے رائیگاں ہو کر

دیدار تو دکھائے کہیں صبح منتظر
حاضر ہے سر بھی سجدۂ بے اختیار کو

یاد آئی آشیانہ پر خار کی خلش
دل ڈھونڈتا ہے پھر اسی اجڑے دیار کو

دوسرے قسم کے اشعار وہ ہیں جن میں روزمرہ اور محاورات کی بھرمار ہے لیکن ان میں بھی فارسی الفاظ و تراکیب کا بڑی ہنرمندی سے استعمال کیا گیا ہے، سچ تو یہ ہے کہ ان سب کے علاوہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ سادہ اور با محاورہ ہے کہ اسی سے ان کی شخصیت منکشف ہوتی ہے۔

دل طوفان شکن تنہا جو آگے تھا سو اب بھی ہے
بہت طوفان ٹھنڈے پڑ گئے ٹکرا کے ساحل سے

برابر بیٹھنے والے بھی کتنے دور تھے دل سے
میرا ماتھا جبھی ٹھنکا فریب رنگ محفل سے

میں سمجھ لوں گا دوست سے تو کون
مجھے رہ رہ کے تاننے والے

ارادے نے عمل کی راہ پائی کتنی مشکل سے
الٰہی خیر تو ہے لگ گئے پہلی ہی منزل سے

جلایا ایسے ویسوں کو جبھی تو ناک میں دم ہے
ہم ایسے خاکساروں کو تپاؤ تو دھواں کیوں ہو

پڑ چکے بہت پالے، ڈس چکے بہت کالے
موذیوں کے موذی کو فکر نیش عقرب کیا

الٹی تھی مت زمانۂ مردہ پرست کی
میں اک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا

یگانہ کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے اشعار میں ان معروف فقروں کا بھی استعمال کیا ہے جو ان کے وقت میں رائج نہ تھے۔ اسی طرح وہ اردو کے ٹھیٹھ الفاظ، ہندی کے الفاظ اور محاورات کا بھی بڑی خوبی سے استعمال کر گئے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ان الفاظ کی وسعت اور ان میں موجود امکانات سے باخبر تھے۔ ملاحظہ فرمائیں یہ اشعار جن میں ان کا یہ فن نکھر کر ہمارے سامنے آتا ہے ۔

عجب بھول بھلیا ہے منزل ہستی
بھٹکتا پھرتا ہے گم گشتہ کارواں اپنا

کار مرگ کے دن کا تھوڑی دیر کا جھگڑا
دیکھنا ہے ناداں جینے کا ہے کرتب کیا

کون ٹھہرے سے کے دھارے پر
کوہ کیا اور کیا خس و خاشاک

رلا رلا کے غریبوں کو ہنس چکا کل تک
مری طرف سے اب اپنی دسا پہ ہنستا جا

بول بالا رہے یگانہ کا
نام باجے جگت کے چاروں دانگ

کسی کے روپ میں تم بھی تو اپنے درشن دو
جہاں میں شاہ و گدا رنگ لائے ہیں کیا کیا

یگانہ تنقید کے اہم ستون راہی معصوم رضا کا یہ قول کہ وہ اپنے عہد کے تضادات کے ہنگامہ میں چراغ کی لو کی طرح لڑکھڑاتے رہے لیکن موجود رہے اور نتیجے اخذ کرتے رہے، بہت حد تک صداقت پر مبنی ہے۔ان کے اس قول سے ایک بات یہ نکل کر سامنے آتی ہے کہ یگانہ دراصل ضدی قسم کے آدمی تھے ورنہ وہ بات بے بات کسی سے نہ الجھتے، وہ شاید زمانہ شناس بھی نہ تھے کہ زمانے کا رنگ بھانپ لیتے اور اسی کے مطابق فیصلے لیتے۔یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی غریب الوطنی کے مسائل سے دوچار ہوئے تو کبھی تنہائی کی صبر آزما مصیبت سے۔ان کی شاعری کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کے یہاں ان لوازمات کی بازگشت صاف صاف سنائی دے رہی ہے۔اس میں ان کے جوش بیان اور کرارے پن کا اہم حصہ تو ہے ہی ان کی طنز نگاری کا بھی اہم رول ہے۔خواہ یہ بات صاف صاف نظر نہ آئے لیکن اس میں طنز کی کارفرمائی کو دخل ضرور ہے۔جس میں ان کے تمسخر آمیز لہجہ نے بھی اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔دیکھیں یہ اشعار جس سے اس اہم پہلو کی طرف ہماری توجہ خود بخود مبذول ہو جاتی ہے۔

اتنا تو زندگی کا کوئی حق ادا کرے
دیوانہ وار حال پہ اپنے ہنسا کرے

زہر میٹھا نہ ہو تو زہر ہی کیا
دوست جب دے تو پوچھنا کیا ہے

نکالے عیب میں حسن، حسن میں سو عیب
خیال ہی تو ہے جیسا بندھے جدھر گذرے

بات ادھوری مگر اثر دونا
اچھی لکنت زبان میں آئی

اسیر حال نہ مردوں میں ہے نہ زندوں میں
زبان کٹتی ہے آپس میں گفتگو کرتے

مرے فرشتے بھی شاید ہیں آپ کے جاسوس
کہ آہ کرتے ہی پرچہ لگے، خبر گذرے

مزہ جب ہے کہ رفتہ رفتہ امیدیں پھلیں پھولیں
مگر نازل کوئی فصل الٰہی ناگہاں کیوں ہو

پڑ چکے بہت پالے ڈس چکے بہت کالے
موذیوں کے موذی کو فکر نیش عقرب کیا

جفائے پنجۂ خونخوار سے جو بس نہ چلے
تو بن کے خشک نوالہ گلے میں پھنستا جا

افسردہ خاطروں کی خزاں کیا بہار کیا
کنج قفس میں مر رہے یا آشیانے میں

ان اشعار کا عام قاری بھی یہ تاثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان سبھی میں صرف طنزیہ انداز ہی نہیں اپنایا گیا ہے بلکہ اس میں ایک قسم کی کڑک اور تیزی بھی مسلط ہے۔ ملاحظہ فرمائیں یہ شعر۔

جو غم بھی کھائیں تو پہلے کھلائیں دشمن کو
اکیلے کھائیں گے ایسے تو ہم گنوار نہیں

خواہ پیالہ ہو یا نوالہ ہو
بن پڑے تو جھپٹ لے، بھیک نہ مانگ

ایسے اشعار ایک خاص ذہنی رو (Attitude) کا حامل شخص ہی کہہ سکتا ہے۔ وہ چاہتے تو آخری شعر اپنے استاد شاد عظیم آبادی کی طرح نہایت نرم اور مدھم لہجے میں یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ ؎

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس خاص انداز کو برتنے میں ان کی ندرت پسند طبیعت کے ساتھ ساتھ ان کے طنزیہ و مزاحیہ بلکہ تمسخر آمیز لہجے (Irony, Humour & Satire) کا خاصا اہم رول ہے۔ ایسے میں کبھی کبھی ان کا لہجہ غم و غصہ سے بھرا ہوا بھی نظر آ جاتا ہے جس میں کہیں کہیں تو نشتریت کا عنصر حاوی ہوتا ہے۔ لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ ان کے یہاں ظرافت کی چاشنی بھی ہے اور مزاح کی پر کیف گدگدی بھی۔ میرا خیال ہے کہ یہی وہ شاعرانہ فن کاری اور ہنر بھی ہے جو مرزا یاس یگانہ چنگیزی کو دیگر شعرا سے ممتاز و ممیز بناتا ہے۔ دیکھیں اس قبیل کے چند اشعار ؎

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

کدھر چلا ہے ادھر اک رات بستا جا
گرجنے والے گرجتا ہے کیا برستا جا

صبر کرنا سخت مشکل ہے تڑپنا سہل ہے
اپنے بس کا کام کر لیتا ہوں آساں دیکھ کر

حسن پر فرعون پھبتی کہی
ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی

آگ میں ہو جسے جلنا تو وہ ہندو بن جائے
خاک میں ہو جسے ملنا وہ مسلماں ہو جائے

مرزا یگانہ دراصل ایک آزاد روانسان تھے انھیں کسی قسم کی پابندی گوارا نہ تھی، ادرادبی پنڈت کے ساتھ ساتھ مذہبی ملا انھیں پابند کرنے کے درپے تھے۔ ان کی یہی آزادہ روی ان پنڈتوں اور ملاؤں کوراس نہ آئی تو انھوں نے ان کے خلاف سازش شروع کر دی۔ سچ تو یہ ہے کہ آج بھی انہی جیسوں نے اپنے مفاد کی خاطر عوام کو گمراہ کر رکھا ہے، ہم میں گروہ بندیاں قائم کر رکھی ہیں، رنگوں، نسلوں اور فرقوں کا پیچ ڈال رکھا ہے تاکہ ہم بیجا ولغو چیزوں کو اپنا سرمایۂ حیات گردانتے رہیں اور ہماری نظر حق اور حقیقت تک پہنچ ہی نہ سکے۔ مرزا یاس یگانہ نے اپنے فن سے اس رویہ کی پرزور مخالفت کی ہے، دیکھیں یہ اشعار۔

کیسے کیسے خدا بنا ڈالا
کھیل بندے کا ہے خدا کیا ہے

خداؤں کی خدائی ہو چکی بس
خدا را بس دہائی ہو گئی بس

بندے نہ ہوں گے جتنے خدا ہیں خدائی میں
کس کس خدا کے سامنے سجدہ کرے کوئی

دل سے خدا کا نام لئے جا، کام کئے جا دنیا کا
کافر ہو دیں دار ہو دنیادار نہیں تو کچھ بھی نہیں

کھٹکا نہ لگا ہو تو مزا کیا گناہ میں
لذت ہی اور ہوتی ہے چوری کے مال میں

طاعت ہو یا گناہ پس پردہ خوب ہیں
دونوں کا جب مزہ ہے کہ تنہا کرے کوئی

جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے
کس قدر واعظ مکار ڈراتا ہے مجھے

یہ سبھی اشعار مرزا یگانہ کی فن کاری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ خصوصاً آخری شعر کس قدر خوب صورت ہے اس کا اندازہ اکبرالہ آبادی کے اس شعر کے تناظر میں محسوس کیجیے، لطف دوبالا ہو جائے گا۔

اف ری چالاکیاں، اف ری عیاریاں
لومڑی کیا ہوئی، مولوی ہوگئی

میری نظر میں مرزا یگانہ ایک خود آگاہ و خود پرست شاعر ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے کلام اور ان کی شخصیت دونوں ہی سے ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں ہی رجحانات ایک خاص ماحول و مزاج کے پروردہ ہوا کرتے ہیں۔ کوئی بھی بالغ نظر شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان کے پہلے مجموعہ کلام ''نشتر یاس'' سے لے کر آخری لمحات شاعری تک جو کچھ بھی انھوں نے رقم کیا ان سب میں اس خاص ماحول اور مزاج کا اہم حصہ ہے۔ اس میں کہیں خود کو منوانے کی ضد ہے تو کہیں اس بات کی دھن کہ سب پر سبقت لے لی جائے، خواہ وہ غالب و اقبال ہی کیوں نہ ہوں۔ ورنہ کیا عجب ہے کہ جب ان کا پہلا مجموعہ منظر عام پر آنے والا تھا وہ قومی اور ملی شاعری سے پینگیں نہ بڑھاتے، تمام عالم پر منڈلا رہے خوف کے سائے کا ذکر نہ کرتے، اولین جنگ عظیم سے پیدا شدہ ہولناکیوں اور انسانی غم و اندوہ اور پسپائی کے اظہار سے گریز کر جاتے یہ رویہ اسی ذہنیت کا شاخسانہ ہے۔ کیا انھیں ان حالات کی خبر ہی نہ تھی، یا وہ عمداً اس سے دامن بچا گئے؟ ایسا ہرگز نہیں تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اسی تگ و دو میں مصروف رہے، اسی ادھیڑ بن میں سرگرداں رہے کہ اپنی پگڑی کیسے بچائی جائے اور اپنے مخالفین کو کس طرح کرارا جواب دیا جائے۔ انھیں اولین جنگ عظیم یا ہندوستان کی سیاسی صورتحال یا پھر دنیا میں رونما ہونے والے کسی تاریخی واقعہ کو نظم کرنے کی کوئی ضرورت کیوں محسوس نہیں ہوئی۔ وجہ آئینہ کی طرح صاف ہے کہ وہ ان حالات سے قطعی بے خبر نہیں تھے۔ انھیں اپنے احساسات، تجربات و مشاہدات صفحۂ قرطاس پر اتارنے کا ہنر معلوم تھا لیکن وہ یہ

کام نہیں کر سکے، جبکہ یہ کام ان کے دور کے دیگر شعرا بڑی تن دہی سے، بڑی جانفشانی سے کر رہے تھے، یہ ان سبھی کا محبوب موضوع تھا۔ خصوصاً ترقی پسند شعرا اور ادیبوں کا تو یہی اوڑھنا بچھونا تھا، اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ وہ سبھی ادب کو تنقید حیات گردانتے تھے جبکہ یگانہ کے یہاں یہ سوچ ناپید تھی تبھی تو وہ خاموش تماشائی بنے رہے۔ میری نظر میں یہ اسی رویہ کا غماز ہے جس کا میں نے ذکر کیا۔ اولین جنگ عظیم یا اس سے پیدا شدہ مسائل کوئی پہلا اور آخری موقع نہیں تھا بلکہ ان کی ادبی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے طویل ترین ادبی وشعری سفر میں تاریخ انسانیت نے کئی کروٹیں لیں کئی اہم موڑ کاٹے خصوصاً تاریخ ہند نے نہ جانے کتنے اتھل پتھل کا سامنا کیا لیکن انھوں نے اس طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ پہلی جنگ عظیم کو چھوڑ بھی دیں تو کیا دوسری جنگ عظیم، ہندوستان میں ملک گیر پیمانے پر چلائی جانے والی مختلف ادبی، سیاسی، سماجی ومعاشرتی تحریکیں جس سے پورا سماج متاثر تھا ان کے لیے موضوع اور مواد نہیں فراہم کر رہا تھا، یقیناً یہ دور ایسا ہی تھا۔ ان کی تصنیفات کے حوالے سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایک جگہ خود انھوں نے حسن عشق، آزادی وحریت، تہذیب واخلاق وانسانیت وغیرہ کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دیا تھا۔ لیکن یگانہ کے کلام کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ انھیں ان سب چیزوں سے کوئی سروکار نہ تھا، ان کے ذریعہ رقم کی گئی یہ ساری باتیں، باتیں ہی تھیں یا پھر وہ اس قسم کے اظہار سے قاصر تھے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف وہی ہے یعنی ان کے اندر ''خود مرکزیت'' کا پایا جانا، ان کا خود پرست ہونا۔ دیکھیں ان کا یہ شعر جس میں وہ اپنے دل کی بات کہہ گئے کہ ان میں بھی جذبات حریت وآزادی موجزن ہے لیکن وہ کیا کریں کہ ان کی تنگنائے غزل میں ہی وہ وسعت اظہار نہیں پایا جاتا۔

اسیرِ شوق آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے
مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا

اب ذرا ''غالب شکن'' کی ان رباعیات پر نظر ڈال لی جائے جو انھوں نے غالب سے متعلق کہیں تھیں۔ چہ جائیکہ اس مرحلے پر وہ شاعر کے بجائے ایک پھکو ہی نظر آتے ہیں۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا بھی تجزیہ ہونا چاہیے۔ اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ اس رو سے بھی ان کی نفسیاتی کیفیت، ان کی شخصیت اور شاعری کا محاکمہ کیا جا سکے۔ ایسا اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ وہ خاص مرحلہ ہے جب انھوں نے نہایت طنزیہ بلکہ مبتذل اور عامیانہ انداز

اختیار کیا ہے۔ مقام افسوس ہے کہ وہ طنز کو زہر خند بھی نہ بنا سکے۔ دیکھیں یہ رباعیاں جن میں وہ اس دھار کو اس قدر تند کر دیتے ہیں کہ ان کے شاعرانہ خلوص پر شک ہونے لگتا ہے۔

تلوار سے کچھ کام نہ کھانڈے سے غرض
مومن سے سروکار نہ ناندے سے غرض
رنگون میں دم توڑتا ہے شاہ ظفر
غالب کو ہے حلوے مانڈے سے غرض

دیوانوں کے یہ زور نہ دیکھے نہ سنے
نادانوں کے یہ شور نہ دیکھے نہ سنے
جھنڈے پہ چڑھانے کو چڑھاتے ہیں مگر
غالب سے چچا چور نہ دیکھے نہ سنے

شہزادے پڑے فرنگیوں کے پالے
مرزا کے گلے میں موتیوں کے مالے
واللہ گریبان میں منہ ڈال کے دیکھ
غالب کو وطن پرست کہنے والے

کیوں کیا ہوئے وہ بہادری کے جوہر
سو پشتوں کی سپہ گری کے جوہر
پنشن کے لئے دلّی سے کلکتے تک
دکھلانے چلے ہو شاعری کے جوہر

غالب کو میر سے بڑھانے والے
چوروں کو بانس پر چڑھانے والے
اندھوں کو اپنے ساتھ لئے ڈوبیں گے
دنیا کو غلط سبق پڑھانے والے

خاصا نہ سہی گھر میں کھرچن ہے بہت
تن ڈھکنے کو صاحب کا اتارن ہے بہت
دلی کی سلطنت گئی تو ٹھینگے سے
نوشہ کے لئے خلعت و پنشن ہے بہت

ان رباعیوں کے حوالے سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں انھوں نے ذاتی مفاد کو ہی ملحوظ رکھا ہے اور غالب کی پگڑی اچھالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے خواہ اس کی وجہ جو بھی رہی ہو۔ اگر وہ چاہتے تو ان میں بھی شگفتگی پیدا ہونے کے امکانات تھے لیکن اس سے کس قدر ترشی پیدا ہوگئی اس سے ہم سبھی واقف ہیں۔ ان رباعیات کے پس منظر میں اگر غالب سے متعلق ان کے کلام کا احتساب کیا جائے تو اس میں تنقید کی آڑ میں تنقیص کا عنصر بازی مار لے جاتا ہے، ورنہ یگانہ نے انھیں چور، پنشن خوار، خلعت کا بھوکا اور پیٹ کا بندہ وغیرہ نہ کہا ہوتا۔ صرف ان کی شاعری کو موضوع بحث بنایا ہوتا اور بس۔ چونکہ غالب کی شاعرانہ عظمت کا ہر دور میں اعتراف کیا گیا ہے اور وہ خود بھی ان کی شاعرانہ عظمت کے معترف تھے۔ اس لیے بھی انھوں نے یہ طرز سخن ایجاد کیا ہو کہ انھیں مدعا حاصل ہو سکے۔ ان کے اس رویہ پر ادبی دنیا میں بھونچال آنا فطری تھا شاید یہی سبب رہا ہو کہ ان کے سخت ترین ناقد ماہر القادری نے نہایت کرخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے انھیں بھی کمینہ، لفنگا اور بازاری تک قرار دے دیا۔ دیکھیں یہ اقتباس:

> ''میرا ایقان ہے کہ جو شخص غالب کو شاعر تسلیم نہیں کرتا اسے شاعری سے ذرا بھی لگاؤ نہیں۔۔۔۔ یہ کون سی شرافت ہے کہ اگر ہم کسی سے اختلاف رکھتے ہیں اور جب اس کے عیب گنانا شروع کر دیں تو ''مادر''، ''چادر'' پر اتر آئیں۔ یہ تو کمینوں، لفنگوں اور بازاری لوگوں کا کام ہے۔''[1]

میرے خیال میں ایسی تنقید کو خواہ وہ یگانہ کی خامہ فرسائی کا نتیجہ ہو کہ ماہر القادری کے زور نقد کا، احساس کمتری پر ہی محمول کیا جانا چاہیے کہ ادب میں اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یگانہ کی

---

1 ماہر القادری: یگانہ شاعری، ساقی 1934 صفحہ 68-66

شخصیت ہی کچھ ایسی ہے کہ اس کی گرہیں کھولتے جایئے اور خود ہی الجھتے جایئے۔ کبھی تو وہ انتہائی درجہ کی چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور کبھی اس قدر سادہ لوح بن جاتے ہیں کہ کیا کہنا۔ اس کا اندازہ ان کی اس رباعی سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو غالب سے متعلق تمام معاملات کو رفع دفع کر نے کے لیے کہی گئی تھی۔

دونوں دیوانے ہیں علیؑ کے طالب
جان ایک ہے گو جدا جدا ہیں قالب
مذہب میں، شاعری میں، قومیت میں
غالب ہیں یگانہ اور یگانہ غالب

رباعی کا انداز دیکھیے، اس میں انھوں غالب و یگانہ کا اتنا عمدہ تقابل کیا ہے کہ کئی مشترک خوبیاں از خود اجاگر ہو گئیں، مثلاً دونوں کا شیعان علی ہونا، شاعر ہونا، مرزا ہونا وغیرہ۔ ان کے علاوہ بھی دونوں میں کئی مماثلتیں موجود ہیں جس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ حق پرستی کا تقاضہ تھا کہ اس پر بھی روشنی ڈالی جاتی لیکن وہ اتنی ہمت نہ کر سکے۔

خیر، یگانہ کے مجموعہ ہائے شعر میں ایک اہم مجموعہ ''ترانہ'' بھی ہے جس میں صرف رباعیات شامل ہیں۔ میری نظر میں اس کا خصوصی طور پر ذکر ہونا چاہیے کہ یہ وہی کلام ہے جو انھیں مداح میر انیس ثابت کرتا ہے۔ رباعی کہنا اور اس انداز سے کہنا کہ ان کے سخت ترین ناقدین بھی جو انھیں غزل گو شاعر ماننے کو راضی نہ ہوں ان سے لوہا منوا لینا یقیناً اپنے اندر کچھ تو فن کاری ضرور رکھتا ہوگا۔ حق تو یہ ہے کہ اس فن میں بہت کم شعرا کو شہرت نصیب ہوئی اگر ایک طرف اس فن میں میر انیس طاق ہیں تو دوسری جانب یگانہ، فراق اور جوش بس چند نام ہی ایسے ہیں جن کی شناخت اس فن کی بنا پر بھی ہے۔ اس سلسلے میں باقر مہدی کا یہ کہنا مبنی بر حقیقت ہے کہ اس فن میں میر انیس کے بعد مرزا یگانہ کا ہی نام آتا ہے۔ جن سے نہ صرف ان کے ہم عصر متاثر و مستفیض ہوئے بلکہ آج بھی اس فن میں وہ ہماری رہنمائی کر رہے ہیں۔ ایسا صرف اس لیے کہ چار مصرعوں میں پرواز تخیل کو وہ بلندی عطا کر دینا کہ ایک سماں پیش نظر ہو بڑی بات ہے۔ یہاں تشبیہات و استعارات، ندرت خیال، بندش الفاظ اور دیگر صنائع و بدائع کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس میں مہارت کے بغیر

بات بنائے نہیں بنتی بلکہ اکثر ماہرین فن لہجہ کے اتار چڑھاؤ اور اس نزاکت کو برت ہی نہیں پاتے جو کہ اس فن کا خاصہ ہے، نتیجتاً ان کا بھرم قائم ہونے کے بجائے سب پر عیاں ہو جاتا ہے۔ یگانہ کو اس فن پر کس قدر قدرت تھی اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے غالب جیسی نابغہ روزگار شخصیت پر وار کرنے کے لیے بھی اسی فن کا سہارا لیا۔ یہاں ان سے بحث مقصود نہیں ہاں ان کو پیش نظر رکھا جائے گا جو ان کی فن کاری پر دلالت کرتے ہیں۔ دیکھیں یہ رباعیاں جن میں وہ مختلف پیغامات عام کرتے نظر آتے ہیں اور ان کی قراءت کے وقت ہمیں رباعیات میر انیس کا مزہ بھی ملتا ہے۔

ساجن کو سکھی منالو پھر سولینا
سوئی قسمت جگالو پھر سولینا
سوتا سنسار ، سننے والا بیدار
اپنی بیتی سُنا لو پھر سولینا

بظاہر اس میں کوئی بڑا پیغام تو نہیں لیکن ساجن کی اہمیت کو ضرور اجاگر کیا گیا ہے کہ اگر ساجن روٹھ گیا تو مانو قسمت روٹھ گئی۔ اس لیے ضروری ہے کہ خواہ پوری دنیا سو جائے تم تو مت سوؤ کہ تمھارا ساجن تو بیدار ہے اس سے اپنی افسردگی کی وجہ بیان کرو، اس سے بتاؤ کہ وہ کیوں کر برہ کی آگ میں جل رہی ہے، سکھی سونا ہی ہے تو پہلے ساجن کو آپ بیتی سنالو پھر سولینا، نہایت سادگی و پرکاری سے مزین ہے۔ شاعر نے اپنے مخصوص طرز ادا سے رباعی کو دلنشیں بنا دیا ہے۔ دیکھیں چند اور رباعیاں جس میں ان کا فن اپنے عروج پر ہے۔

دل کیا ہے اک آگ ہے دہکنے کے لئے
دنیا کی ہوا کھا کے بھڑکنے کے لئے
یا غنچۂ سر بستہ چٹکنے کے لئے
یا خار ہے پہلو میں کھٹکنے کے لئے

واللہ یہ زندگی بھی ہے قابل دید
اک طرفہ طلسم، دید جس کی نہ شنید

منزل کی دھن میں جھومتا جاتا ہوں
پیچھے تو اجل ہے آگے آگے امید

منزل کا پتا ہے نہ ٹھکانہ معلوم
جب تک نہ ہو گم ، راہ پہ آنا معلوم
کھولیتا ہے انسان تو کچھ پاتا ہے!
کھویا ہی نہیں تونے تو پانا معلوم

دکھتا ہوا دل ٹٹول لینے والا
آنکھوں آنکھوں میں تول لینے والا
دل کی آواز گوش دل سے سن کر
کیا ہے کوئی درد مول لینے والا

درد اپنا کچھ اور ہے، دوا ہے کچھ اور
ٹوٹے ہوئے دل کا آسرا ہے کچھ اور
ایسے ویسے تو خدا بہترے ہیں
میں بندہ ہوں جس کا وہ خدا ہے کچھ اور

چارہ نہیں کوئی جلتے رہنے کے سوا
سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تری حیات فانی کیا ہے
جھونکا کھانے سنبھلتے رہنے کے سوا

مندرجہ بالا رباعیوں میں مختلف موضوعات زیر بحث تھے سبھی پر اظہار خیال ممکن نہیں ہاں آخری رباعی ذرا تفصیل طلب ہے کہ جس میں فلسفۂ زندگانی کو پیش کیا گیا ہے کہ دنیا میں جب آئے ہیں تو جینا ہی پڑے گا خواہ اس میں کسی قدر پریشانیوں کا سامنا کیوں نہ ہو۔ یہاں زندگی کو شمع

سے تشبیہ دے کر اور اس کی 'لو' کو جھونکوں کے مقابل دکھا کر جد و جہد کا ہنر سکھانا اہمیت کا حامل ہے۔ اس رباعی میں دوب کی طرح سے دب دب کر نکلنا سیکھو والا انداز ہے یا پھر میر انیس کا وہ انداز جس میں انھوں نے کچھ اس قسم کی بات کہی ہے کہ۔

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

آیئے اب چند ایسی رباعیاں پیش کی جائیں جن میں میرزا صاحب نے دنیا اور بے ثباتی دنیا کا تصور پیش کیا ہے، زندگی کی ناکامی و نامرادی سے مد مقابل ہونے کا پیغام دیا ہے نیز پامردی و استقلال کو موضوع بنایا ہے کہ یہ سبھی موضوعات مرثیہ نگاروں کے محبوب موضوع رہے ہیں۔ ان کے علاوہ اردو شاعری میں اس راہ کے راہی فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی اور پنڈت برج نارائن چکبست جیسے چند شعرا ہی ہیں، لیکن ان سبھی میں سب سے توانا اور پاٹ دار آواز مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی ہے۔

دنیا کے مزے ہیں کس قیامت کے مزے
صحرا کی گھنی چھاؤں میں جنت کے مزے
کچھ دیر تو بیٹھے چلو سائے میں
کیا یاد کرو گے دشت غربت کے مزے

ہاں اے دل ایذا طلب آرام نہ لے
بدنام نہ ہو مفت کا الزام نہ لے
ہاتھ آ نہ سکے پھول تو کانٹے ہی سہی
ناکام پلٹنے کا کبھی نام نہ لے

مشکل کوئی شکل نہیں جینے کے سوا
خاموش لہو کا گھونٹ پینے کے سوا

کھلتے ہیں جب ہی جوہر تسلیم ورضا
جب کوئی سپر ہی نہ ہو سینے کے سوا

وہ جوش وہ اضطراب منزل میں کہاں
وہ شوق طلب تھکے ہوئے دل میں کہاں
شاعر کی تہ کو فلسفی کیا پہنچے
منجدھار کا زور شور ساحل میں کہاں

مردوں کو یہ دنیائے دنی کیا پھیلتی؟
سر پھوڑ چلے، کوہ کنی کیا چلتی؟
معلوم ہے فرہاد پہ جو کچھ گزری
ٹل جائے قیامت ، شدنی کیا ٹلتی؟

بادل کو لگی کھلتے برستے کچھ دیر
دل کو نہ لگی اجڑتے بستے کچھ دیر
بچوں کی طرح موم ہوا ہوں ایسا
روتے کچھ دیر نہ ہنستے کچھ دیر

مرزا یگانہ کو لکھنؤ سے والہانہ محبت تھی اس کا ثبوت تو ہمیں اسی وقت مل جاتا ہے۔ جب وہ اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر اسے وطن ثانی بنا لیتے ہیں۔ اس محبت کی داد بھی دی جانی چاہیے کہ اس کے صلے میں انھیں نہ جانے کیا کیا قیمتیں چکانی پڑیں۔ اس سے قبل غزلیہ اشعار کے سہارے کئی اشارے کیے جا چکے ہیں۔ جن میں ان کی ذہنی اور معاشی بدحالی سبھی کچھ کا نقشہ ابھر جاتا ہے۔ یہاں صرف رباعیوں پر ہی توجہ مرکوز کی جا رہی ہے کہ اس حوالے سے بھی مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی بازیافت کا عمل انجام دیا جا سکے۔

اے لکھنؤ ، اے دیار دور افتادہ
اے جان من اے بہار دور افتادہ

اب دور سے اس خاک کو سجدہ کرلے
میں کون ہوں اک مزار دور افتادہ

اللہ رے تصور کی یہ رنگیں نظری
غربت میں بھی دل جلوں کی کھیتی ہے ہری
کروٹ کروٹ ہے لہلہاتی جنت
جب تک ہے ہوائے لکھنؤ آشیاں میں بھری

اے پائے طلب ہوا پہ سبقت لے چل
اس وادئی وحشت سے سلامت لے چل
وہ جان وفا نہ جانے کس حال میں ہے
لے چل مجھے لکھنؤ، امانت لے چل

گھر چھوڑ جو دربدر ہوا کچھ نہ ہوا
بیکار کا درد سر ہوا کچھ نہ ہوا
فانوس کے باہر نہ تھی شمع کی لو
جب دھیان ادھر اُدھر ہوا کچھ نہ ہوا

دنیا سے الگ بیٹھے ہو دامن جھاڑے
بکھرائے ہوئے بال گریبان پھاڑے
روٹھے تو سہی پھر بھی نہ پیچھا چھوڑا
گھر چھوڑ کے جا بیٹھے کہاں پچھواڑے

گذری ہے بہار عمر تنکے چنتے
آتش کدۂ شوق میں جلتے بھنتے

یاران چمن گاتے ہیں اپنی اپنی
میری سنتے تو دیر تک سر دھنتے

ہوں صید کبھی اور کبھی صیاد ہوں میں
کچھ بھی نہیں بازیچۂ اضداد ہوں میں
مختار مگر اپنی حدوں میں محدود
ہاں وسعت زنجیر تک آزاد ہوں میں

ان عقل کے اندھوں میں ہے یہ غل کیسا
میں جزو ہوں وہ کُل یہ تعقل کیسا
کُل ہی کُل ہے کہاں کا جز کیسا جز
کُل جز سے الگ ہوا تو پھر کُل کیسا

ارمان نکلنے کا مزہ ہے کچھ اور
اور رشک سے جلنے کا مزہ ہے کچھ اور
ہاں یاد ہے دوست سے لپٹنا، لیکن
دشمن کو کچلنے کا مزہ ہے کچھ اور

موجوں سے لپٹ کے پار اترنے والے
طوفان بلا سے نہیں ڈرنے والے
کچھ بس نہ چلا تو جان پر کھیل گئے
کیا چال چلے ہیں ڈوب مرنے والے

کعبہ کی طرف دور سے سجدہ کر لوں
یا دیر کا آخری نظارہ کر لوں

کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا
اک اور گنہہ کر لوں کہ توبہ کر لوں

امکان طلب سے کوئی آگاہ تو ہو
منزل کا پتہ دل سے ہوا خواہ تو ہو
چل پھر کے ذرا دیکھ جھجکتا کیا ہے
مل جائے گی راہ راست گمراہ تو ہو

اس امر کا بارہا اعتراف کیا گیا ہے کہ یگانہ ایک ماہر زبان داں تھے جس پر لکھنوی اہل زبان نے مہر ثبات ثبت کر دی تھی اور اسی بنا پر انھیں مخالفتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ لیکن اس بات پر کم ہی لوگوں کی نگاہ گئی ہوگی کہ انھوں نے اپنی زبان دانی کے زعم میں اپنی غزلوں اور رباعیوں میں کئی مرتبہ ہندی کے ایسے الفاظ بھی استعمال کر دیے جو روزمرہ کے خلاف تو ہیں ہی اسے ایک زبان داں بھی پہلی نظر میں سمجھنے سے قاصر ہے چہ جائیکہ نئی تنقید کے نو وارد ناقد۔ بطور مثال یہاں ایک ایسی رباعی پیش کی جارہی ہے جس میں دو نامانوس الفاظ نے اس رباعی کی روح کو ہی مجروح کر دیا ہے۔

آندھی اٹھ کے پہاڑ کے دامن سے
ہاتھی کو اڑا لے گئی کجلی بن سے
اب کون سی طاقت کرے پامال اس کو
پتاتا پھرے جو اپنے ہلکے پن سے

یہاں ''کجلی بن'' اور ''پتاتا پھرے'' کے استعمال نے عام قاری کو مجبور کر دیا کہ وہ اسے سمجھنے کے لیے ذہن پر زور ڈالے یا کسی زبان داں کی مدد لے۔ آیئے پہلے ''کجلی بن'' کی بات کی جائے، یہ ہندی کا لفظ ہے اس کے لیے سنسکرت میں ''کدلی بن'' کا لفظ مستعمل ہے جس کے معنی کیلے کا باغ ہے۔ واضح رہے کہ کیلا ہاتھی کی مرغوب غذا بھی ہے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہاتھی اپنے زعم میں کیلے کے بن یا باغ میں داخل ہو گیا ہے، اندیشہ ہے کہ کیلے کا باغ کہیں پامال نہ کر دے۔ کیلے کے

باغ کو پامال کرنا ہاتھی جیسے طاقتور جانور کے لیے کوئی اہم بات نہیں کہ وہ تو بڑے بڑے پیڑ اکھاڑ دینے پر قادر ہے۔لیکن یہ منظر دیکھ کر پہاڑ کے دامن سے آندھی اٹھی اور اسے اڑا لے گئی کہ کسی نحیف وناتواں پر آنچ نہ آئے۔شاعر کا یہ کہنا کہ اب کون سی طاقت کرے پامال اس کو کہ ہاتھی جیسا جسیم وشحیم جانور تو اپنے ہلکے پن پر شرمندہ ہے، احساس ندامت سے پسپا ہے کہ اس نے ایسی حماقت کی ہی کیوں ۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی کیونکہ یگانہ نے اگر چہ ہاتھی کے زعم ناقص کو چکنا چور ہوتے ہوئے دکھایا ہے اوراس بات کا اعلان کیا ہے کہ ہر فرعون راموسیٰ والی بات مبنی بر حقیقت ہے لیکن وہ اس بات کا خیال نہیں رکھ پائے کہ ایسے میں کیلے کا باغ بھی تو برباد ہو گیا ہوگا۔اس رباعی کا پیغام یہ ہے کہ تکبر کا نتیجہ ذلت وخواری کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے تو فارسی کے قادرالکلام شاعر نے بھی کہا تھا کہ

"تکبر عزازیل را خوار کرد
بہ زندان لعنت گرفتار کرد"

مدعا یہ کہ ایسے میں نہ صرف رباعی کا زور ختم ہو گیا بلکہ اُس کا مقصد بھی کہ رباعی آخری مصرعہ میں اپنی منتہا کو پہنچ کر ترسیل کا عمل نہیں انجام دے پائی۔یہاں رباعی کا فن بھی مجروح ہوا کہ جس پر یگانہ کو بہت ناز تھا۔وہ اگر "پٹا تا پھرے" کی جگہ "شرمندہ رہے" کا روزمرہ کا استعمال کر لیتے تو نہ کوئی گنجلک پن در آتا، نہ ہی کوئی الجھن پیدا ہوتی اور یہ بات آئینہ ہو جاتی کہ ہاتھی اور آندھی میں سے کون کس قدر توانائی رکھتا ہے، نیز یہ بھی کہ کسے اپنی بے بضاعتی پر شرمندگی ہے، احساس ندامت ہے۔یگانہ نے ایسا صرف اپنی زبان دانی کا سکہ جمانے کے چکر میں ہی کیا، اور ایک نامانوس لفظ نے بنتی ہوئی بات خراب کر دی۔مرزا یگانہ نے اس رباعی میں اگر روزمرہ کا استعمال کیا ہوتا تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔ایسا انھوں نے پیروئ آتش میں کیا ہو تو بھی بعید نہیں کہ ان کے یہاں بھی اسی قسم کا ایک شعر کچھ یوں ملتا ہے۔

صنوبر سے جو کرتا قد کشی تو
نہ گڑ جاتا تو پٹایا تو ہوتا

اس رباعی کی تشریح وتوضیح کا مقصد یگانہ کی زبان دانی اوران کے فن پر ضرب لگانا ہرگز

نہیں تھا۔ یہاں صرف اس جانب توجہ مبذول کرانی تھی کہ پیروئ دیگراں میں ایک جینوین فن کار سے بھی اس قسم کی فاش غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔ ورنہ کیا عجب ہے کہ انھوں نے اردو ادب کو اس قدر خوب صورت رباعیاں بھی دی ہیں۔

ہاں فکر رسا دیکھ بڑا بول نہ بول
گنجینۂ راز اندھی نگری میں نہ کھول
جس کی جتنی ضرورت ، اتنی قیمت
ہیرا کبھی کنکر ہے، کبھی انمول

دنیا میں رہ کے راست بازی کب تک
مشکل ہے کچھ آسان نہیں سیدھا مسلک
سچ بول کے کیا حسین بننا ہے تجھے
اتنا سچ بول، دال میں جیسے نمک

بے دردہو، کیا جانو مصیبت کے مزے
ہیں رنج کے دم قدم سے راحت کے مزے
دوزخ کی ہوا تو پہلے کھا لو صاحب
کیا ڈھونڈتے ہو ابھی جنت کے مزے

دنیا سے الگ جاکے کہیں سر پھوڑو
یا جیتے جی مردوں سے ناتا جوڑو
کیوں ٹھوکریں کھانے کو پڑے ہو بیکار
بڑھنا ہے بڑھو، نہیں تو رستہ چھوڑو

اللہ غنی بتوں کی یہ جلوہ گری
کیا ساری خدائی ہے خداؤں سے بھری
اتنے ہیں خدا تو خود پرستی ہی بھلی
یکسوئی ہے اچھی کہ پریشاں نظری؟

مہمان ہے تو، صاحبِ خانہ ہوں میں
آئینۂ حسنِ جاودانہ ہوں میں
مجھ سا کوئی دوسرا، نہ تجھ سا کوئی
یکتائے جہاں تو ہے، یگانہ ہوں میں

ان میں یگانہ نے اپنے دلی جذبات کا اظہار بھی کیا ہے اور اس تجربے کو پیش کرنے کی سعی بھی جن سے وہ بہ نفسِ نفیس گزرے ہیں۔ ان سب میں ان کا ساتھ اس صنفِ سخن کی خوبیوں نے تو دیا ہی ہے، ان کی فن کاری نے بھی اس میں یک گونہ کردار ادا کیا ہے۔ آخر میں یگانہ کے منشورِ زندگی ''مغالطہ'' میں درج کیے گئے خیال کا یہ اہم حصہ جس میں انھوں نے ایک کامیاب زندگی کے گر بتاتے ہوئے کہا تھا کہ زندگی تو وہی ہے کہ دنیا سے اٹھ جانے پر بھی جس کی یاد، دوست و دشمن دونوں کے دلوں کو گرماتی رہے۔ مرزا یگانہ کا یہ نقطۂ نظر بالکل درست ہے جسے انھوں نے اس رباعی میں بھی پیش کیا ہے۔

حیران کیوں ہے رازِ بقا مجھ سے پوچھ
میں زندۂ جاوید ہوں آ مجھ سے پوچھ
مرتے ہیں کہیں دلوں میں بسنے والے
جینا ہے تو موت کی دوا مجھ سے پوچھ

اس میں شک نہیں کہ ان کی شخصیت و شاعری کا مرکز و محور صداقت، اصول پسندی اور خودداری و خود پرستی ہے۔ ان کی نظر میں یہی وہ رازِ بقا اور سراغِ زندگی ہے جسے انھوں نے پالیا تھا اور اسی بنا پر وہ آج بھی دلوں میں جگہ بنائے ہوئے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ انہی خصوصیات سے وہ ''یگانہ آرٹ'' پروان چڑھا ہے جس پر وہ تا حیات نازاں و فرحاں رہے ہیں۔ ''یگانہ فہمی'' کے سلسلہ میں ان کی پوری شاعری کو بالائے طاق رکھیے صرف اس رباعی کا لہجہ، اس کا پیغام اور اس میں موجود زیریں لہروں سے گزر جائیے۔ یگانہ کی شخصیت اور ان کی شاعری آپ پر خود بہ خود منکشف ہوتی چلی جائے گی۔

انتخاب کلام

(غزلیات اور رباعیات)

غزلیات

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا — خدا بنے تھے یگانہ، مگر بنا نہ گیا
پیام زیرِ لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا — اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا
ہنسی میں وعدۂ فردا کو ٹالنے والو — لو دیکھ لو وہی کل آج بن کے آ نہ گیا
گناہ زندہ دلی کہیے یا دل آزاری — کسی پہ ہنس لیے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا
پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا — خدا تھے اتنے، مگر کوئی آڑے آ نہ گیا
سمجھتے کیا تھے؟ مگر سنتے تھے ترانۂ درد — سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سُنا نہ گیا
کروں تو کس سے کروں دردِ نارسا کا گلہ — کہ مجھ کو لے کے دلِ دوست میں سما نہ گیا
بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا — خدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا

کرشن کا ہوں پجاری، علی کا بندہ ہوں
یگانہ شانِ خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

کس دلِ بیقرار کو تو نے یہ ولولہ دیا؟ — دیتا نہ دیتا ایک ہے، ظرف سے جب سوا دیا
ہائے یہ روشنیِ طبع، اف یہ بلائے رنگ و بو — چشمِ ہوس پرست نے پھر سے جواں بنا دیا

کانوں میں آ رہی ہے کیا دور کے ڈھول کی صدا؟ خوابِ نظر فریب نے سر تو نہیں پھرا دیا؟
لیک سے بڑھ کے ایک ہے واہ رے لطفِ زندگی! تحفۂ نوش و نیش نے خوب مزا چکھا دیا
حسن کی آنکھیں کھل گئیں، اس میں برائی کیا ہوئی؟ روئے سیاہ کار سے پردہ اگر اٹھا دیا
داورِ حشر کچھ نہ پوچھ، دورِ شباب کا مزا شہدِ بہشت تھا، مگر دستِ بخیل کا دیا
جذبہ عاشقانہ دیکھ، حکمت بندگانہ دیکھ
بن کے یگانہ میں نے خود نقشِ دوئی مٹا دیا

سجدۂ صبح و شام کیا کرتا غائبانہ سلام کیا کرتا
جو نہ سمجھے خود اپنا مطلبِ شوق وہ پیام و سلام کیا کرتا
جسے چاہا بنا لیا دیوتا بندۂ بے امام کیا کرتا
نہ چلی کچھ تو بد دعا ہی سہی دہن بے لگام کیا کرتا
جس کی تلوار کا ہو لوہا تیز حُجت ناتمام کیا کرتا
ارے کیسی سزا، کہاں کی جزا ہچکچاتا تو کام کیا کرتا
وقت جس کا کٹے حسینوں میں کوئی مردانہ کام کیا کرتا
مجھ سے معنی شناس پر جادو حسنِ صورت حرام کیا کرتا
ایسے ہنگامہ زرا ہستی میں ایک اللہ کا نام کیا کرتا
بندۂ خاص پر، مرا مولا نگہِ فیضِ عام کیا کرتا
یہ مساوات تحفۂ ناچیز
وہ یگانہ کے نام کیا کرتا

قیامت ہے شبِ وعدہ کا اتنا مختصر ہونا فلک کا شام سے دست و گریبانِ سحر ہونا
شبِ تاریک نے پہلو دبایا روزِ روشن کا زہے قسمت مرے بالیں پہ تیرا جلوہ گر ہونا
حریمِ ناز میں کب تک گھٹے گی بوئے پیراہن ہوائے شوق میں لازم ہے اک دن منتشر ہونا
تماشائے چمن کی کیا حقیقت چشمِ عبرت میں اثر ہونا تو لازم ہے مگر الٹا اثر ہونا
اسیروں کی فغاں اب اور تڑپانے لگی دل کو قفس کی سختیوں کا چاہیے تھا کچھ اثر ہونا
ہوائے تند سے کب تک لڑے گا شعلۂ سرکش عبث ہے خود نمائی کی ہوس میں جلوہ گر ہونا
دلِ آگاہ نے بے کار میری راہ کھوٹی کی بہت اچھا تھا انجامِ سفر سے بے خبر ہونا
بہار آتے ہی شادیٔ مرگ ہو جاؤں تو اچھا ہے خزاں سے پہلے ہی بہتر ہے قصہ مختصر ہونا
دیارِ بے خودی ہے اپنے حق میں گوشۂ راحت غنیمت ہے گھڑی بھر خوابِ غفلت میں بسر ہونا

سما سکتے نہیں الفاظ میں معنیٰ وجدانی　　مگر لازم ہے دل ہی دل میں پوشیدہ اثر ہونا
وہی ساقی، وہی ساغر، وہی شیشہ، وہی بادہ　　مگر لازم نہیں ہر ایک پر یکساں اثر ہونا
سنا کرتے تھے آج آنکھوں دیکھیں دیکھنے والے
نگاہ یاس کا سنگیں دلوں پر کارگر ہونا

کون ایسا ہے جاننے والا　　جان کر تجھ کو ماننے والا
پہلے اپنی تو ذات پہچانے　　راز قدرت بکھانے والا
پیٹ کے ہلکے لاکھ بڑ ماریں　　کوئی کھلتا ہے جاننے والا
جان کر اور ہو گیا انجان　　ہو تو ایسا ہو جاننے والا
راہ چلتے لپٹ پڑے نہ کہیں　　بے دھڑک دل میں ٹھاننے والا
دن کو دن سمجھے اور نہ رات کو رات　　وقت کی قدر جاننے والا
میں سمجھ لوں گا دوست سے، تو کون؟　　مجھے رہ رہ کے تاننے والا
حُسن کافر، گناہ کا پیاسا　　بے گناہوں کو ساننے والا
تو نے جانا مجھے تو کیا جانا!　　تجھ سے اچھا نہ جاننے والا
جیت بھی اپنی ہے، پٹ بھی اپنی ہے　　میں کہاں ہار ماننے والا
خاک میں مِل کے پاک ہوجاتا　　چھانتا کیا ہے چھاننے والا
کیوں نہ مانے یگانہ کو یکتا
اصل کو ایک جاننے والا

سب ترے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا　　سر پھرا دے انساں کا ایسا خبطِ مذہب کیا
اک اشارۂ فردا، ایک جنبش لب کیا　　دیکھئے دکھاتا ہے وعدۂ تذبذب کیا
چلّو بھر میں متوالی، دو ہی گھونٹ میں خالی　　یہ بھری جوانی کیا، جذبۂ لبا لب کیا
شامت آگئی آخر کہہ گیا خدا لگتی　　راستی کا پھل پاتا بندۂ مقرب کیا
الٹی سیدھی سنتا رہ، اپنی کہہ تو الٹی کہہ　　سادہ ہے تو کیا جانے بھانپنے کا ہے ڈھب کیا
سب جہاد ہیں دل کے، سب فساد ہیں دل کے　　بے دلوں کا مطلب کیا اور ترکِ مطلب کیا
ہو رہے گا سجدہ بھی جب کسی کی یاد آئی　　یاد جانے کب آئے، زندہ داریٔ شب کیا
آندھیاں رکیں کیونکر، زلزلے تھمیں کیونکر　　کار گاہِ فطرت میں پاسبانیٔ رب کیا
کار مرگ کے دن کا، تھوڑی دیر کا جھگڑا　　دیکھنا ہے یہ ناداں جینے کا ہے کرتب کیا
پڑ چکے بہت پالے، ڈس چکے بہت کالے　　موذیوں کے موذی کو فکر نیش عقرب کیا

میرزا یگانہ واہ! زندہ باد! زندہ باد!
اک بلائے بے درماں جب تم کیا تھے اور اب کیا

ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا کیا — ہوس نے شوق کے پہلو دبائے ہیں کیا کیا
نہ جانے سہو قلم ہے کہ شاہکار قلم — بلائے حسن نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا
نگاہ ڈال دی جس پر وہ ہو گیا اندھا — نظر نے رنگ تصرف دکھائے ہیں کیا کیا
اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دور — اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا
پیامِ مرگ سے کیا کم ہے مژدۂ ناگاہ؟ — اسیر چونکتے ہی تلملائے ہیں کیا کیا
کسی کے روپ میں تم بھی تو اپنے درشن دو — جہاں میں شاہ و گدا رنگ لائے ہیں کیا کیا
کہاں کے معنی و مطلب؟ یہ راگ ہے کچھ اور — الا اپنے پہ مرے حال آئے ہیں کیا کیا
پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے — اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا
گزر کے آپ سے ہم، آپ تک پہنچ تو گئے — مگر خبر بھی ہے کچھ پھیر کھائے ہیں کیا کیا
بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا — بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا
خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے — وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا

خدا ہی جانے یگانہ میں کون ہوں کیا ہوں
خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا

پالا امید و بیم سے ناگاہ پڑ گیا — دل کا بنا بنایا گھروندا بگڑ گیا
اُلٹی تھی مت زمانۂ مردہ پرست کی — میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا
شربت کا گھونٹ جان کے پیتا ہوں خونِ دل — غم کھاتے کھاتے مُنھ کا مزا تک بگڑ گیا
بُوئے وفا کہاں چمن روزگار میں — دل ہٹ گیا ہے جیسے کوئی پھول جھڑ گیا
کس سادگی سے میں نے بڑھایا تھا دست شوق — مجھ سے بد مزاج یکا یک اکھڑ گیا
ایسے کے پاؤں چومئے یا پیار کیجئے؟ — قدموں پہ میں جھکا تو وہ دونا اکڑ گیا
منہ زوریوں کا حوصلہ سرکار حسن سے؟ — آخر پڑی وہ مار کہ چرسہ ادھڑ گیا
وہ مرد ہے جو زیر کرے دیو نفس کو — وہ مرد کیا جو پیر فلک سے پچھڑ گیا
اللہ ری کشاکش دیر و حرم کہ یاس — حیرت کے مارے بیچ دوراہے پہ گڑ گیا

پہلے تو آپ اپنے کو پہچانتے نہ تھے
حسن یگانہ کس کی نگاہوں میں تڑ گیا

دنیا کا چلن ترک کیا بھی نہیں جاتا — اس جادۂ باطل سے پھرا بھی نہیں جاتا

زندانِ مصیبت سے کوئی نکلے تو کیوں کر — رُسوا سر بازار ہوا بھی نہیں جاتا
دل بعد فنا بھی ہے گر ان بارِ امانت — دنیا سے سبکدوش اٹھا بھی نہیں جاتا
کیوں آنے لگے شاہدِ عصمت سرِ بازار — کیوں خاک کے پردے میں چھپا بھی نہیں جاتا
اک معنیِ بے لفظ ہے اندیشۂ فردا
جیسے خط قسمت کہ پڑھا بھی نہیں جاتا

سلسلہ چھڑ گیا جب یاس کے افسانے کا — شمع گل ہو گئی، دل بجھ گیا پروانے کا
عشق سے دل کو ملا آئینہ خانے کا شرف — جگمگا اُٹھا کنول اپنے سیہ خانے کا
خلوت نازکجا اور کجا اہل ہوس — زور کیا چل سکے فانوس سے پروانے کا
وائے حسرت کہ تعلق نہ ہوا دل کو کہیں — نہ تو کعبہ کا ہوا میں، نہ صنم خانے کا
تشنہ لب ساتھ چلے شوق میں سایہ کی طرح — رخ کیا ابر بہاری نے جو مے خانے کا
واہ کس ناز سے آتا ہے ترا دورِ شباب — جس طرح دور چلے بزم میں پیمانے کا
کیا عجب ہے جو حسینوں کی نظر لگ جائے — خون ہلکا ہے بہت آپ کے دیوانے کا
آپ اب شمع سحر بڑھ کے گلے ملتی ہے — بخت جاگا ہے بڑی دیر میں پروانے کا
بزم میں صبح ہوئی چھا گیا اک سناٹا
سلسلہ چھڑ گیا جب آپ کے افسانے کا

ہنوز زندگی تلخ کا مزانہ ملا — کمال صبر ملا، صبر آزمانہ ملا
مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں ہے — مزاج اس دل بے اختیار کا نہ ملا
جواب کیا ، وہی آواز بازگشت آئی — قفس میں نالۂ جاں کاہ کا مزانہ ملا
اُمید وار رہائی قفس بدوش چلے — جہاں اشارۂ توفیق غائبانہ ملا
ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس — عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پانہ ملا
امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر — کہاں کے دیر و حرم، گھر کا راستہ نہ ملا
خوشا نصیب، جسے فیض عشق شور انگیز — بقدر ظرف ملا، ظرف سے سوانہ ملا
سمجھ میں آگیا جب عذر فطرت مجبور — گناہ گار ازل کو نیا بہانہ ملا
بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے — وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا
نگاہ یاس سے ثابت ہے سعیِ لاحاصل
خدا کا ذکر تو کیا، بندۂ خدا نہ ملا

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا — پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

برا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گمراہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا
ازل سے تیرا بندہ ہوں ترا ہر حکم آنکھوں پر
مگر فرمان آزادی بجالانا نہیں آتا
مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کرکے تنہا پار اُتر جانا نہیں آتا
مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشہ سے مرجانا نہیں آتا
دل بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں
وہ آنسو کیا پئے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا
اسیرو، شوق آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے
مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا

سراپا راز ہوں میں، کیا بتاؤں کون ہوں، کیا ہوں
سمجھتا ہوں، مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

چلے چلو جہاں سے جائے ولولہ دل کا
دلیل راہِ محبت ہے فیصلہ دل کا
ہوائے کوچہ قاتل سے بس نہیں چلتا
کشاں کشاں لئے جاتا ہے ولولہ دل کا
گلہ کسے ہے کہ قاتل نے نیم جان چھوڑا
تڑپ تڑپ کے نکالوں گا حوصلہ دل کا
خدا بچائے کہ نازک ہے ان میں ایک سے ایک
تنک مزاجوں سے ٹھہرا ہے معاملہ دل کا
دکھا رہا ہے یہ دونوں جہاں کی کیفیت
کرے گا ساغر جم کیا مقابلہ دل کا
کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی
کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

پیالہ خالی اٹھا کر لگالیا منہ سے
کہ یاس کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

بیٹھا ہوں پاؤں توڑ کے تدبیر دیکھنا
منزل قدم سے لپٹی ہے تقدیر دیکھنا
پہنا دیا ہے طوقِ غلامی تو ایک دن
میری طرف بھی مالکِ تقدیر دیکھنا
آوازیں مجھ پہ کستے ہیں پھر بندگان عشق
پڑ جائے پھر نہ پاؤں میں زنجیر دیکھنا
مردوں سے شرط باندھ کے سوئی ہے اپنی موت
آئینہ رکھ کے سامنے تصویر دیکھنا
ہوش اُڑ نہ جائیں صنعت بہزاد دیکھ کر
ہاں دیکھنا ذرا فلکِ پیر دیکھنا
چونکے تو چشم شوق میں عالم سیاہ تھا
خواب نظر فریب کی تعبیر دیکھنا
پروانے کر چکے تھے سرانجام خودکشی
فانوس آڑے آگیا تقدیر دیکھنا
شاید خدانخواستہ آنکھیں دغا کریں
اچھا نہیں نوشتہ تقدیر دیکھنا
ہر خوب و زشت آپ ہی اپنی مثال ہے
حدّ کمال کاتب تقدیر دیکھنا

بادِ مراد چل چکی لنگر اٹھاؤ یاس
پھر آگے بڑھ کے خوبی تقدیر دیکھنا

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا
نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

چراغ سے لے کے کسے ڈھونڈھتے ہیں دیوانے
نشاں تو دور ہے، یاں نام تک نہیں دل کا

ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر
ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا

نہ سر میں نشہ ہے باقی، نہ دل میں کیفیت
زباں پہ رہ گیا اک ذکرِ خیر محفل کا

کبھی تو موج میں آئے گا تیرا دیوانہ
اشارہ چاہئے ہے جنبش سلاسل کا

خود اپنی آگ میں جلتا تو کیسا ہوتا
مزاج داں نہ تھا پروانہ شمعِ محفل کا

جواب حسن طلب بے دلوں سے بن نہ پڑا
حیا سے گڑ گئے جب نام آگیا دل کا

فلک ہے دونوں طرف کا نگاہ باں جب تک
نہ اپنی آنکھ اٹھے گی نہ پردہ محمل کا

حضور دوست یگانہ کچھ ایسے غائب تھے
زبانِ گنگ تک آیا نہ ماجرا دل کا

چراغ زیست بجھا دل سے اک دھواں نکلا
لگا کے آگ مرے گھر سے میہماں نکلا

دل اپنا خاک تھا پھر خاک کو جلاتا کیا؟
نہ کوئی شعلہ اُٹھا اور نہ کچھ دھواں نکلا

تڑپ کے آبلہ پا اٹھ کھڑے ہوئے آخر
تلاش یار میں جب کوئی کارواں نکلا

لہو لگا کے شہیدوں میں ہو گئے داخل
ہوس تو نکلی، مگر حوصلہ کہاں نکلا

لگا ہے دل کو اب انجام کار کا کھٹکا
بہارِ گل سے بھی اک پہلوئے خزاں نکلا

زمانہ پھر گیا، چلنے لگی ہوا الٹی
چمن کو آگ لگا کر جو باغباں نکلا

کلامِ یاس سے دنیا میں پھر اک آگ لگی
یہ کون حضرتِ آتش کا ہم زباں نکلا

قفس کو جانتے ہیں یاس آشیاں اپنا
مکان اپنا، زمین اپنی، آسماں اپنا

بس ایک سایۂ دیوار یار کیا کم ہے
اٹھا لے سر سے مرے سایہ آسماں اپنا

سنا ہے رنگ زمانہ کا اعتبار نہیں
بدل نہ جائے یقیں سے کہیں گماں اپنا

کدھر سے آتی ہے یوسف کی بوئے مستانہ
خراب پھرتا ہے جنگل میں کارواں اپنا

جرس نے مژدۂ منزل سنا کے چونکایا
نکل چلا تھا دبے پاؤں کارواں اپنا

خدا کسی کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے
قفس کے سامنے جلتا ہے آشیاں اپنا

ہمارا رنگِ سخن یاس کوئی کیا جانے
سوائے آتش ہے کون ہم زباں اپنا

وہ جوانی کی موج، وہ منجدھار
خیر نیت بخیر، بیڑا پار

آپ کیا جانیں مجھ پہ کیا گزری
صبح دم دیکھ کر گلوں کا نکھار

حُسن اب تک ہے خوابِ غفلت میں / دیکھئے کس ہوا سے ہو بیدار
تو بھی جی اور مجھے بھی جینے دے / جیسے آباد گُل سے پہلوئے خار
منھ جو تکتی ہو مرگِ دشمن کا / ایسی تلوار پر خدا کی مار
جاگتا خواب دیکھئے کب تک / چشمِ امید پر خدا کی سنوار
بے نیازی بھلی کہ بے ادبی؟ / لڑکھڑاتی زباں سے شکوۂ یار؟
بندگی کا ثبوت دوں کیوں کر؟ / اس سے بہتر ہے کیجئے انکار
عشق ہی عین زندگی تو نہیں / ہاں مگر زندگی کا آلۂ کار
ایسے دو دل بھی کم ملے ہوں گے / نہ کشاکش ہوئی، نہ جیت، نہ ہار

بن پڑے تو یگانہ بن کر دیکھ
عکس کوئی اتر سکے تو اتار

جو دل نہیں رکھتا کوئی مشکل نہیں رکھتا / مشکل نہیں رکھتا کوئی، جو دل نہیں رکھتا
کھینچے لئے جاتا ہے کہیں شوقِ شہادت / دم لینے کی تاب اب دلِ بسمل نہیں رکھتا
ہوں ریگ کے مانند شب و روز سفر میں / آوارۂ وحشت کوئی منزل نہیں رکھتا
مجبور ہوں، کیا زور چلے جوشِ جنوں سے / زنجیر کوئی پاؤں کے قابل نہیں رکھتا
کعبے سے ہو یا دیر سے منزل پہ پہنچ جاؤں / اک دھن ہے تمیزِ حق و باطل نہیں رکھتا
مے خانے کو دیکھے کوئی ان آنکھوں سے غافل / ان نور کا دریا ہے کہ ساحل نہیں رکھتا
کوثر بھی کھنچ آئے تو یہ نیت نہیں بھرتی / دریائے ہوس وہ ہے کہ ساحل نہیں رکھتا
آیا نہ کوئی خواب میں بھی ملکِ عدم سے / افسوس کہ اتنی بھی کشش دل نہیں رکھتا
لیلیٰ کو بھلا دیکھے گا کن آنکھوں سے مجنوں / جب طاقتِ نظارۂ محمل نہیں رکھتا

کیوں یاس قفس میں بھی وہی زمزمہ سنجی
ایسا تو زمانے میں کوئی دل نہیں رکھتا

قصہ کتابِ عمر کا کیا مختصر ہوا / رخ داستانِ غم کا ادھر سے ادھر ہوا
ماتم سرائے دہر میں کس کس کو روئیے / اے وائے دردِ دل نہ ہوا، دردِ سر ہوا
آزاد ہو سکا نہ گرفتارِ شش جہت / دل مفت بندہ ہوسِ بال و پر ہوا

دنیا کے ساتھ دین کی بیگار، الاماں!
انسان آدمی نہ ہوا، جانور ہوا

لذّت زندگی مبارک باد — کل کی کیا فکر، ہر چہ بادا باد
اے خوشا زندگی کہ پہلوے شوق — دوست کے دم قدم سے ہے آباد
بندۂ عشق ، آہ کیا جانے؟ — کسے کہتے ہیں بندۂ آزاد
دل سلامت ہے، درد دل نہ سہی — درد جاتا رہا، کہ درد کی یاد؟
مڑ کے دیکھا نہ آشیاں کی طرف — خون ہو ہو کے دل میں رہ گئی یاد
کشش لکھنؤ، ارے توبہ — پھر وہی ہم ، وہی امین آباد
زیست کے ہیں یہی مزے، واللہ — چار دن شاد، چار دن ناشاد
کون دیتا ہے داد ناکامی؟ — خونِ فرہاد، برسرِ فرہاد
صبر اتنا نہ کر، کہ دشمن پر — تلخ ہو جائے لذّتِ بیداد

صلح کر لو یگانہ ، غالب سے
وہ بھی استاد، تم بھی اک استاد

خداؤں کی خدائی ہو چکی بس — خدا رابس دہائی ہوچکی بس
کہیں پتھر بھی ہو سکتا ہے پانی — دعاؤں کی رسائی ہو چکی بس
کسی ڈھب سے نپٹ لو جب مزا ہے — بہت زور آزمائی ہو چکی بس
بجھائے کون تو جس کو جلائے — پتنگوں کی چڑھائی ہو چکی بس؟
ہوا میں اڑ گیا ایک ایک پتا — گلوں کی جگ ہنسائی ہو چکی بس
بھلا اب کیا چھوں اپنی نظر میں — نظر اپنی، پرائی ہو چکی بس
رہا کیا جب دلوں میں فرق آیا؟ — اسی دن سے جدائی ہو چکی بس
بہت پہنچا تو نادیدہ یہ سمجھا! — تخیّل کی رسائی ہو چکی بس

پڑے ہو کون سے گوشے میں تنہا
یگانہ کیوں خدائی ہو چکی بس؟

تو کہاں اور کہاں وہ جلوۂ پاک؟ — دل بے باک، تیری آنکھ میں خاک
کھا گیا کتنے جاں نثاروں کو — پردے پردے میں شعلۂ بے باک
دیکھیے کیا خدا دکھاتا ہے — آپ نازک مزاج ، ہم بے باک
کھل گئے، جیسے موم کی مریم — کیوں بڑھایا تھا دل جلوں سے تپاک
بد گمانوں کی مہربانی سے — پاک دامن بچے، نہ دامن چاک

ذات میں اپنی کیا نہیں موجود عشق سا زہر، عقل سا تریاک
آسماں کی ذرا سی گردش میں کوئی ہلکان اور کوئی ہلاک
کون ٹھہرے سمے کے دھارے پر کوہ کیا اور کیا خس و خاشاک
میں کہاں اور کہاں کے پست و بلند ایک ٹھوکر میں تھا بکھیڑا پاک
حسن اپنا بھی دیکھ لوں اک دن عشق چاہے تو کر دے خاک سے پاک
ہوش کیا پائے گا پتا میرا
لے اڑا دور جوہر ادراک

حسن فطرت بولتا ہے پردۂ اسرار میں معنی بے لفظ پنہاں ہیں زبان خار میں
ذوق جب تک ہے، تبھی تک ہے بہار رنگ و بو دل ہے جب تک دل جبھی تک ہے کھٹک بھی خار میں
خواب شیریں کی ہوس کیا؟ خواب بد کا خوف کیا آچکی اک نیند اپنے دیدۂ بیدار میں
نشۂ یک رنگ میں دونوں ہیں، کیا ڈوبے ہوئے کیسی جنگ زرگری ہے کافر و دیندار میں
غفلت امروز میں اندیشۂ فردا ہو گم نشہ اتنا ہو کم از کم وعدۂ دیدار میں
ناخدا کچھ زور طوفاں آزمائی بھی دکھا فکر ساحل چھوڑ، لنگر ڈال دے منجدھار میں
یاس گمراہی سے اچھی زحمت واماندگی
ڈال لو زنجیر کوئی پائے کج رفتار میں

کیا چل سکے گی باد مخالف مزار میں؟ جلتا ہے دل جلوں کا چراغ اس دیار میں
الٹی ہوا زمانے میں چلتی ہے آج کل فرق آگیا ہے گردشِ لیل و نہار میں
یوسف کو لے اڑے نہ کہیں بوئے پیرہن اخفائے حسن و عشق نہیں اختیار میں
منزل کی دھن میں آبلہ پا چل کھڑے ہوئے شورِ جرس سے دل نہ رہا اختیار میں
کس کل پہ ہے یہ خاک کا پُتلا بنا ہوا کیا جانے کیا طلسم ہے مشتِ غبار میں
لیلیٰ کجا، کجا یہ طلسماتِ عنصری کیا ڈھونڈتا ہے پردۂ گرد و غبار میں
کہتے ہو اپنے فعل کا مختار ہے بشر اپنی تو موت تک نہ ہوئی اختیار میں
دنیا سے یاس جانے کو جی چاہتا نہیں!
واللہ کیا کشش ہے اس اجڑے دیار میں

گوشہ گیری ہے اک انوکھا سانگ مانگتا ہے کھلے خزانے مانگ
پوچھنا کیا زمانہ سازوں کا نت نیا بھیس، نت نرالا سانگ
شیخ کی کون سی ہے کل سیدھی ارے جو بات ہے سواوٹ پٹانگ

کس طلب میں چلا ہے بے اٹکل　　آنکھ والوں سے پہلے آنکھیں مانگ
صلح ٹھہری تو ہے برہمن سے　　کہیں مذہب اڑا نہ دے کوئی ٹانگ
خواہ پیالہ ہو، یا نوالہ ہو　　بَن پڑے تو جھپٹ لے، بھیک نہ مانگ
بول بالا رہے یگانہ کا
نام باجے جگت کے چاروں دانگ

حسن وہ حسن جس کا روپ، نہ رنگ　　نت نیا رنگ، نت نرالا ڈھنگ
حسن کیا، حسن کی تجلّی کیا؟　　رنگ لایا ہے جلوۂ بے رنگ
اس نگاہِ رسا کو کیا کہئے　　جس پہ ہو عرصۂ دو عالم تنگ
دیکھئے لے اڑا کہاں سے کہاں؟　　نشۂ رنگ و بوئے رنگا رنگ
کام کیا فلسفی کا، رندوں میں　　کیوں ہو بیٹھے بٹھائے رنگ میں بھنگ
مُردہ دل کو ٹٹولنے والو　　چھیڑتے کیا ہو سازِ بے آہنگ
کیا اب آگے نہیں کوئی منزل؟　　کیا ہوئی دل کی وہ لگن، وہ اُمنگ
وہی الجھے، نہ الجھے خاروں سے　　جس کا دل تنگ، جس کی دنیا تنگ
بنتے بنتے بنے تھے پریم بھگت　　دل لگی بڑھتے بڑھتے لائی رنگ
سنگدل کو بنادوں میں دیوتا　　آپ کیا جانیں بندگی کے ڈھنگ؟
آہ کے ساتھ کھل نہ جائے بھرم　　درد کتنا ہے دل میں، کتنی امنگ
میر کے آگے زور کچھ نہ چلا
تھے بڑے میرزا یگانہ دبنگ

جان پیاری ہے، حیاتِ جاوداں پیاری نہیں　　زندگی کیا، موت کی جب گرم بازاری نہیں
صبر کہتا ہے کہ رفتہ رفتہ مِٹ جائے گا داغ　　دل یہ کہتا ہے کہ بجھنے کی یہ چنگاری نہیں
جلوہ گر رہنے لگا چشمِ تصور میں کوئی　　حضرتِ دل بے سبب راتوں کی بیداری نہیں
دیکھتے ہی دیکھتے بدلا زمانے کا یہ رنگ　　پھولوں میں خوشبو، حسینوں میں وفاداری نہیں
چھوڑ کر جائیں کہاں اب اپنے ویرانے کو ہم　　کون سی جا ہے، جہاں حکمِ خزاں جاری نہیں
جھیل لیں گے ہجر کے مارے قیامت کا بھی دن
آج کی شب تو کٹے، پھر کوئی دشواری نہیں

خون کے گھونٹ بلانوش پئے جاتے ہیں　　خیر ساقی کی مناتے ہیں، جئے جاتے ہیں
ایک تو درد ملا، اس پہ یہ شاہانہ مزاج　　ہم غریبوں کو بھی کیا تحفے دیئے جاتے ہیں
نہ گیا خوابِ فراموش کا سودا نہ گیا　　جاگتے سوتے تجھے یاد کئے جاتے ہیں

نشۂ حسن کی یہ لہر، الٰہی توبہ — تشنہ کام آنکھوں ہی آنکھوں میں پیے جاتے ہیں
دل ہے پہلو میں کہ امید کی چنگاری ہے — اب تک اتنی ہے حرارت کہ جیے جاتے ہیں
ڈوبتا ہے، نہ ٹھہرتا ہے سفینہ دل کا — دم الٹتا ہے، مگر سانس لئے جاتے ہیں

کیا خبر تھی کہ یگانہ کا ارادہ یہ ہے
ڈوب کر پار اترنے کے لیے جاتے ہیں

دردِ سر تھا سجدۂ شام و سحر میرے لئے — دردِ دل ٹھہرا دوائے دردِ سر میرے لئے
دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو — زندگی پھر کیوں ہوئی ہے دردِ سر میرے لئے
کس محبت سے دلِ گم گشتہ دیتا ہے صدا — آ اِدھر، پھرتا ہے آوارہ کدھر میرے لئے
فطرتِ مجبور کو اپنے گناہوں میں ہے شک — وا رہے گا کب تلک توبہ کا در میرے لئے
لے چلا ہوں وعدۂ فردا گرہ میں باندھ کر — چاہیے ہے اور کیا زادِ سفر میرے لئے
حسنِ نادیدہ کجا، اپنا ہی پردہ کھل گیا — آسماں ثابت ہوا حدِ نظر میرے لئے

بزمِ دنیا میں یگانہ ایسی بیگانہ روی
میں نے مانا عیب ہے، لیکن ہنر میرے لئے

زمانے پر نہ سہی، دل پہ اختیار رہے — دکھا وہ زور کہ دنیا میں یادگار رہے
کہاں تلک دلِ غمناک پردہ دار رہے — زبانِ حال پہ جب کچھ نہ اختیار رہے
نظامِ دہر نے کیا کیا نہ کروٹیں بدلیں — مگر ہم ایک ہی پہلو سے بیقرار رہے
ہنسی میں لغزشِ مستانہ اڑ گئی واللہ — تو بے گناہوں سے اچھے گناہ گار رہے
زمانہ اس کے سوا اور کیا وفا کرتا — چمن اجڑ گیا، کانٹے گلے کا ہار رہے
خزاں کے دم سے مٹا خوب و زشت کا جھگڑا — چلو یہ خوب ہوا، گل رہے نہ خار رہے

یگانہ حال تو دیکھو زمانہ سازوں کا
ہوا میں جیسے بگولہ خراب و خوار رہے

جب تک خلشِ دردِ خدا داد رہے گی — دنیا دلِ ناشاد کی آباد رہے گی
دنیا کی ہوا راس نہ آئے گی کسی کو — ہر سر میں ہوائے عدم آباد رہے گی
چونکائے گی رہ رہ کے تو غفلت کا مزہ کیا — ساتھ اپنے اجل صورتِ ہمزاد رہے گی
دل اور دھڑکتا ہے ادب گاہِ قفس میں — شاید یہ زباں تشنۂ فریاد رہے گی
جو خاک کا پتلا، وہی صحرا کا بگولا — مٹنے پہ بھی اک ہستیِ برباد رہے گی
شیطان کا شیطان، فرشتے کا فرشتہ — انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

شہرہ ہے یگانہ تری بیگانہ روی کا
واللہ یہ بیگانہ روی یاد رہے گی

نہ انتقام کی عادت، نہ دل دکھانے کی بدی بھی کر نہیں آئی مجھے، کجا نیکی؟
دہائی ہے دل درد آشنا دہائی ہے کہ آہ سرد پہ تہمت ہے دل دکھانے کی
سمجھ میں آئی نہ زندان شش جہت کی کشش کہ پاؤں رکھنے کی جا ہے، نہ بھاگ جانے کی
ہوا کے ساتھ پھرے چار سمت آوارہ قدم اُٹھائے جو رفتار پر زمانے کی
ہر ایک ذرّہ سے آتی ہے بوئے زندہ دلی نہ جانے خاک ہے اپنی کس آستانے کی
پلٹ کے گل میں نہ آئے گی بوئے مستانہ نکل کے روح رواں منہ نہیں دکھانے کی
اب اپنے ختم سفر میں کچھ ایسی دیر نہیں جو دیر ہے تو فقط تھک کے بیٹھ جانے کی
ہوس ہے سلسلہ جنبان سعی لاحاصل بھری ہے سر میں ہوا قسمت آزمانے کی

زبان یاس سے آمین تک نہیں نکلی
دعائے خیر تو کرنے کو ناخدا نے کی

ازل سے سخت جاں آمادۂ صد امتحاں آئے عذاب چند روزہ یا عذاب جاوداں آئے
کنول روشن تو ہو دل کا پیام ناگہاں آئے بلا سے شامت پروانۂ آتش بجاں آئے
بہارستان عبرت میں یہ گل کیا، خار کیا، خس کیا سراپا سب کے سب آلودۂ رنگ خزاں آئے
خیال خام ہے بامعنی موہوم کیا جانیں سمجھ میں راز فردا کیوں نصیب دشمناں آئے
وہی آغوش ساحل اور وہی منجھدار کے ڈوبے پلٹ کر خاک میں ملنے کہاں سے پھر کہاں آئے
سکون بی دلی میں کیا کہوں، کیوں لہر پیدا ہے مبادا غیب سے کوئی نوید ناگہاں آئے

حریم ناز کیا ہے؟ جلوہ گاہ بے تماشا ہے
نگاہ یاس کہتی ہے کدھر آئے، کہاں آئے؟

دل عجب جلوۂ امید دکھاتا ہے مجھے شام سے یاس سویرا نظر آتا ہے مجھے
جلوۂ دار ورسن اپنے نصیبوں میں کہاں کون دنیا کی نگاہوں میں چڑھاتا ہے مجھے
دل کو لہراتا ہے ہنگامۂ زندان بلا شور ایذا طلبی وجد میں لاتا ہے مجھے
پائے آزاد ہے زنداں کے چلن سے باہر بیڑیاں کیوں کوئی دیوانہ پنہاتا ہے مجھے
دیدنی ہے چمن آرائی چشم عبرت سیر تازہ گل پژمردہ دکھاتا ہے مجھے

تنگ محفل مرا زندہ، مرا مردہ بھاری کون اٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے
لب دریا کا ہوا میں، نہ تہ دریا کا کون سے گھاٹ پہ دھارا لئے جاتا مجھے
یاس منزل ہے مری، منزل عنقائے کمال
لکھنؤ میں کوئی کیوں ڈھونڈنے آتا ہے مجھے

نگاہ شوق ہوتی یا نگاہ واپسیں ہوتی بہر صورت، زبان گنگ معنی آفریں ہوتی
نگاہ مضطرب کی حد ہے فانوس خیالی تک قیامت تھی اگر پروانہ شمع یقیں ہوتی
فقط دل کی بدولت گرم ہو پہلوئے جاں، ورنہ جسد میں روح اک دیوانہ تنہا نشیں ہوتی
خزاں سے پہلے ہی کاش اپنی آنکھیں بند ہو جاتیں بہار اوّلیں ہوتی، نگاہ واپسیں ہوتی
جو رو سکتے تو آنسو پوچھنے والے بھی مل جاتے شریک رنج و غم دامن سے پہلے آستیں ہوتی
دم آخر فریب جلوۂ بے رنگ نے مارا
نگاہ یاس ورنہ کیوں گنہگار یقیں ہوتی

دیکھا دیکھی جو کوئی آپ کا دیوانہ بنے نقد کیا جان بھی دے بیٹھے تو سودا نہ بنے
دل وہی دل ہے جو ہوا پنی حرارت سے فنا خاک ہو جائے، مگر آگ بگولہ نہ بنے
بجھ گیا دل کا کنول کشمکش شوق کجا شمع خاموش کا کیونکر کوئی پروانہ بنے
کیوں اجل ہے کوئی ایسا کہ مرا منہ ہی دے بات اپنی نہیں بننے کی تو اچھا نہ بنے
رات دن شوق رہائی میں کوئی سر پٹکے کوئی زنجیر کی جھنکار سے دیوانہ بنے
دل آگاہ پہ جادو نہ چلے گا کوئی ہاں مگر مصلحت وقت سے بیگانہ بنے
ڈوب کر دیکھے تو انسان کہیں کا نہ رہے عین حکمت ہے اگر آپ سے بیگانہ بنے
نگہ یاس ارے توبہ جدھر اُٹھ جائے
دل تو کیا، عالم ایجاد بھی ویرانہ بنے

مزہ گناہ کا جب تھا کہ باوضو کرتے بتوں کو سجدہ بھی کرتے تو قبلہ رو کرتے
کبھی نہ پرورش نخل آرزو کرتے نمو سے پہلے جو اندیشۂ نمو کرتے
سنیں نہ دل سے تو پھر کیا پڑی تھی خاروں کو کہ گل کو محرم انجام رنگ و بو کرتے
گناہ تھا بھی تو کیسا گناہ بے لذّت قفس میں بیٹھ کے کیا یاد رنگ و بو کرتے
دلیل راہ دل شب چراغ تھا تنہا بلند و پست میں گزری ہے جستجو کرتے
مزار یاس پہ کرتے ہیں شکر کے سجدے
دعائے خیر تو کیا اہل لکھنؤ کرتے

آ رہی ہے یہ صدا کان میں ویرانوں سے
کل کی ہے بات کہ آباد تھے دیوانوں سے

لے چلی وحشت دل کھینچ کے صحرا کی طرف
ٹھنڈی ٹھنڈی جو ہوا آئی بیابانوں سے

پاؤں پکڑے نہ کہیں کوچۂ جاناں کی زمیں
خاک اڑا تا جو نکل آؤں بیابانوں سے

تنکے چن جا کے کسی کوچہ میں او دست جنوں
کیوں الجھتا ہے عبث چاک گریبانوں سے

آج ہی کل میں ہے چلنے کو نسیم وحشت
تنگ آنے لگے دیوانے گریبانوں سے

نہیں معلوم ان آنکھوں کا اشارہ کیا تھا
جنگ پر تل گئے کفار مسلمانوں سے

جلتے جلتے تو گلے شمع سے مل لیں اُٹھ کر
اب سحر ہوتی ہے کہہ دے کوئی پروانوں سے

آنکھ اٹھا کر نہ کسی سمت قفس سے دیکھا
موسم گل کی خبر سنتے رہے کانوں سے

کیا کوئی پوچھنے والا بھی اب اپنا نہ رہا
درد دل رونے لگے یاس جو بیگانوں سے

بخت بیدار اگر سلسلہ جنباں ہو جائے
شام سے بڑھ کے سحر دست وگریباں ہو جائے

درد کا قحط ہو، دل کا کوئی گاہک نہ رہے
وائے بر عشق کہ بازیچۂ طفلاں ہو جائے

خواب شیریں نہ سہی، خواب پریشاں ہی سہی
دل بہلنے کا شب غم کوئی ساماں ہو جائے

پاؤں پھیلاتے ہیں رہ رہ کے اسیران ہوس
چاہتے ہیں قفس تنگ گلستاں ہو جائے

موت کی یاد میں نیند اور بھی اُڑ جاتی ہے
نیند آ جائے تو کچھ موت کا ساماں ہو جائے

نشۂ حسن کو اس طرح اترتے دیکھا
عیب پر اپنے کوئی جیسے پشیماں ہو جائے

یاس بیداری موہوم ہے ساری ہستی
آنکھ ہو بند تو سب خواب پریشاں ہو جائے

درد دل روئیں کس امید پہ بیگانے سے
صبح ہونے کی نہیں یاس اس افسانے سے

ہوس عالم بالا نے کیا ہے دل تنگ
روح گھبرا گئی اب جسم کے کاشانے سے

حسن معنی کے جو شیدا ہیں، ادھر کیا دیکھیں
صورت آباد جہاں کم نہیں ویرانے سے

ساقیا دل کی ہوس مٹ نہ سکی پیری میں
پیاس بجھتی نہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے سے

اور پردے کی ملاقات کرے گی اندھیر
شمع کیوں چھپتی ہے فانوس میں پروانے سے

دور سے دیکھنے کے یاس گنہگار ہیں بس
آشنا تک نہ ہوئے لب کبھی پیمانے کے

موت آئی ہے، آنے دیجئے پروا نہ کیجئے	منزل ہے ختم سجدۂ شکرانہ کیجئے
نا آشنائے حسن کو کیا اعتبار عشق	اندھوں کے آگے بیٹھ کے رویا نہ کیجئے
تہ کی خبر بھی لایئے ساحل کے شوق میں	کوشش بقدر ہمت مردانہ کیجئے

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجئے

کس دل سے ترک لذت دنیا کرے کوئی	وہ خواب دلفریب کہ دیکھا کرے کوئی
کیا سہل ہے کہ ترک تماشا کرے کوئی	دل سے نہ ہو تو آنکھ سے توبہ کرے کوئی
غنچہ کے دل میں کچھ نہ تھا اک آہ کے سوا	پھر کیا شگفتگی کی تمنا کرے کوئی
آنکھیں ہوں جس کے، آنکھوں ہی آنکھوں میں تاڑ لے	درد اپنا وہ نہیں کہ ٹٹولا کرے کوئی
دل مضطرب نگاہ گرفتار کشش جہت	فرمایئے، کدھر کا ارادہ کرے کوئی
یادش بخیر یاد خدا آ ہی جاتی ہے	اپنی طرف سے لاکھ بھلایا کرے کوئی
اس کی نگاہِ شوق کے قربان جایئے	تجھ ایسے بے نشاں کو جو پیدا کرے کوئی
طاعت ہو یا گناہ، پس پردہ خوب ہے	دونوں کا جب مزہ ہے کہ تنہا کرے کوئی
بندے نہ ہوں گے جتنے خدا ہیں خدائی میں!	کس کس خدا کے سامنے سجدہ کرے کوئی؟

حسن یگانہ آپ ہی اپنا حجاب ہے
حسن حجاب دور سے دیکھا کرے کوئی

اداسی چھا گئی چہرے پہ شمع محفل کے	نسیم صبح سے شعلے بھڑک اٹھے دل کے
عجب نہیں کیا بپا ہو یہیں سے فتنۂ حشر	زمانے بھر میں ہیں سارے فساد اسی دل کے
خوشی کے مارے زمیں پر قدم نہیں رکھتے	جب آئے قافلے والے قریب منزل کے
نظارۂ رخ لیلیٰ مبارک اے مجنوں	نگاہ شوق نے پردے اٹھائے محمل کے

زبان یاس سے افسانۂ سحر سنئے
وہ رونا شمع کا پروانوں سے گلے مل کے

حسن پر فرعون کی پھبتی کہی	ہاتھ لاتا یار کیوں کیسی کہی
دامن یوسف ہی بھڑکاتا رہا	عشق اور ترک ادب؟ اچھی کہی
کون سمجھائے کہ دنیا گول ہے	آپ نے جیسی سنی، ویسی کہی
کوئی ضد تھی یا سمجھ کا پھیر تھا	من گئے وہ میں نے جب الٹی کہی
دوست سے پردہ کیا، یہ کیا کیا؟	آپ بیتی چھوڑ، جگ بیتی کہی

شک ہو کافر کو مرے ایمان میں جیسے میں نے کوئی منہ دیکھی کہی
کیا خبر تھی یہ خدائی اور ہے؟ ہائے میں نے کیوں خدا لگتی کہی
مفت میں سن لی یگانہ کی غزل
ان سنی کر دی جو مطلب کی کہی

کیوں کسی سے وفا کرے کوئی دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی
مفلسی میں مزاج شاہانہ کس مرض کی دوا کرے کوئی
ہنس بھی لیتا ہوں اوپری دل سے جی نہ بہلے تو کیا کرے کوئی
موت بھی آسکی نہ منہ مانگی اور کیا التجا کرے کوئی
دردِ دل پھر کہیں نہ کروٹ لے اب نہ چونکے خدا کرے کوئی
عشق بازی کی انتہا معلوم بن کے بگڑے تو کیا کرے کوئی
کوہ کن اور کیا بنا لیتا شوق سے ابتدا کرے کوئی
اپنے دم کی ہے روشنی ساری دیدۂ دل تو وا کرے کوئی
شمع کیا، شمع کا اجالا کیا دن چڑھے سامنا کرے کوئی
غالب اور میرزا یگانہ کا
آج کیا فیصلہ کرے کوئی

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں
دیواریں پھاند پھاند کے دیوانے چل بسے خاک اڑ رہی ہے چار طرف قید خانے میں
رہ رہ کے جیسے کان میں کہتا ہو یہ کوئی ہوں گے قفس میں کل جو ہیں آج آشیانے میں
افسردہ خاطروں کی خزاں کیا، بہار کیا کنج قفس میں مر رہے، یا آشیانے میں
ہم ایسے بدنصیب کہ اب تک نہ مر گئے آنکھوں کے آگے آگ لگی آشیانے میں
دیوانے بن کے انکے گلے سے لپٹ بھی جاؤ
کام اپنا کرلو پاس بہانے بہانے میں

نظارہ پہ کیا گزری آشوب تماشا سے؟ ہوش آتے ہی دیوانے کھوئے گئے دنیا سے
دیوانے ہوں شرمندہ کیوں چشم تمنا سے؟ اللہ ری خود بینی، باز آگئے لیلیٰ سے
دن بھر تو یہ پروانے جیتے تھے، نہ مرتے تھے کیا کیا نہ اٹھے فتنے اک شعلۂ تنہا سے
دل اپنا جلاتا ہوں، کعبہ تو نہیں ڈھاتا اور آگ لگاتے ہو کیوں تہمت بے جا سے
تہ چاٹتا جاتا ہے، یہ زور ہے دھارے کا ٹکرا کے پلٹ آئیں موجیں لب دریا سے

اے رہزنِ بے پروا، مشکل مری آساں کر
کیوں آنکھ پھراتا ہے گم گشتۂ تنہا سے

ذرہ بھی ہے اک عالم انوار الٰہی کا
ادنیٰ ہی سہی لیکن نسبت تو ہے اعلیٰ سے

حیراں ہیں نظر والے، بیتاب ہیں دل والے
کچھ رنگ تماشا سے، کچھ بوئے تمنا سے

کیوں دل کا کنول آخر لہراتا ہے رہ رہ کر
جھونکا کوئی آ پہنچا کیا عالم بالا سے

کیا اپنے تئیں دیکھیں، کیا ہو گئے اور کیا تھے؟
رفتار نظر عاجز، رفتار تماشہ سے

جو دم ہے غنیمت ہے، کیا جانئے کل کیا ہو
اک دور کی نسبت ہے اِمروز کو فردا سے

کیوں نکہت آوارہ جامے سے نہ ہو باہر
کس دن کو وفا کرتی پیراہن رسوا سے

دنیا کی ہوا کھا کر کیا ڈند مچائی تھی
بیٹھے ہو یگانہ اب کیوں بزم میں تنہا سے؟

بہار زندگی ناداں، بہار جاوداں کیوں ہو
یہ دنیا ہے تو ہر کروٹ وہی آرام جاں کیوں ہو

خدارا میرے ان کے اور کوئی درمیاں کیوں ہو
پیمبر کیوں بنے آخر کسی کا رازداں کیوں ہو

کبھی جلوہ دکھاتے ہو تو آئینہ در آئینہ
کھلا پردہ سہی، پھر بھی یہ پردہ درمیاں کیوں ہو

کوئی ناگفتنی مطلب ہے ان نیچی نگاہوں کا
زباں تک آ نہیں سکتا تو آنکھوں سے بیاں کیوں ہو

بشر ہوں میں، فرشتہ کیوں بنوں؟ جیسا ہوں اچھا ہوں
بغاوت اپنی فطرت سے نصیب دشمناں کیوں ہو

زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں
کوئی صاحب نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو

یہ ناہموار ہی ہموار ہو جائے تو کیا کم ہے
زمیں سے جب نہیں فرصت تو فکرِ آسماں کیوں ہو

ارے یہ کیا کہ چاہوں بھی تو حق سے پھر نہیں سکتا
خود اپنے ہاتھوں گمراہی کی کوشش رائیگاں کیوں ہو

کہیں رسمی عبادت روح کو بیدار کرتی ہے؟
نماز بے عمل سے حق مذہب رائگاں کیوں ہو

اک آنکھیں ہیں کہ تکتی ہیں کسی کو ٹکٹکی باندھے
یہاں سر ہے، نہ سودا ہے تو سجدوں کا نشاں کیوں ہو

تجھی سے اُڑ چلے ہیں پر لگا کر خاک کے پتلے
خدا وندا زمیں سے پست اتنا آسماں کیوں ہو

یگانہ فکر حاصل کیا؟ تم اپنا حق ادا کر دو
بلا سے تلخ گزرے، زندگانی رائگاں کیوں ہو

مستانہ رقص کیجئے گرداب حال میں
بیڑا ہے پار، ڈوب کر اپنے خیال میں

مارا فریب حسن کا، بچنے تو جانئے
کتنے خدا رسیدہ پڑے اس وبال میں

ہاں، کیوں نہ پار اتر چلوں خمیازہ جھیل کر
ڈوبے مری بلا عرق انفعال میں

ترسی ہوئی نگاہوں پہ اب رحم کیجئے
کب تک یہ امتیاز حرام و حلال میں

کیا زندگی کے بعد بھی ہے کوئی زندگی؟
پھر جان، آچلی چمن پائمال میں

واللہ قفس میں آتے ہی کیا مت پلٹ گئی
آخر ہمیں تو ہیں کہ پھڑکتے تھے جال میں

ہوش و خرد، حقیقت روشن کہیں جسے ہے اک جھلک سی پردۂ صد احتمال میں
و اللہ نگاہِ شوق کی معراج ہے یہی وہ خواب دیکھئے جو نہ آئے خیال میں
ممکن کی آرزو میں ہوئے کتنے نامراد اچھی گزر گئی مری فکر محال میں

کیا بزم اتحاد ہے، کیا حسن اتفاق !
بیگانہ و یگانہ ہیں سب ایک حال میں

خدا کی مار وہ ایامِ شور و شر گزرے وہ جن سوار تھا سر پر کہ سر سے در گزرے
حلال بھی مرے حق میں حرام، واویلا نگاہِ شوق سے کیا کیا گل و ثمر گزرے
جو سبز باغ تمنا پہ پھیر دے پانی خدا بچائے ہم ایسی نظر سے در گزرے
نکالے عیب میں سو حسن، حسن میں سو عیب خیال ہی تو ہے جیسا بندھے، جدھر گزرے
زمین پاؤں تلے سے نکل گئی تو کیا ہم اپنی دھن میں زمانے سے بے خبر گزرے
خدا کے بعد بھروسہ ہے حضرتِ دل کا خدانخواستہ شک ایسے دوست پر گزرے
مزانہ پوچھئے، واللہ، دل دکھانے کا کہاں کا خوف خدا، ٹھان لی تو کر گزرے

ادب کے واسطے کتنوں کے دل دکھائے ہیں
یگانہ حد سے گزرنا نہ تھا، مگر گزرے

دل لگانے کی جگہ عالم ایجاد نہیں خواب آنکھوں نے بہت دیکھے، مگر یاد نہیں
سرِ شوریدہ سلامت ہے، مگر کیا کہئے دستِ فریاد نہیں، تیشۂ فرہاد نہیں
تو بہ بھی بھول گئے عشق میں وہ مار پڑی ایسے اوسان گئے ہیں کہ خدا یاد نہیں
تلملانے کا مزہ کچھ نہ تڑپنے کا مزہ ہیچ ہے دل میں اگر دردِ خدا داد نہیں
کیا عجب ہے کہ دل دوست ہو مدفن اپنا کشتۂ ناز ہوں میں، کشتۂ بیدار نہیں
دشمن و دوست سے آباد ہیں دونوں پہلو دل سلامت ہے تو گھر عشق کا برباد نہیں
فکر امروز، نہ اندیشۂ فردا کی خلش زندگی اس کی جسے موت کا دن یاد نہیں

نکہت گل کی ہے رفتار ہوا کی پابند
روحِ قالب سے نکلنے پہ بھی آزاد نہیں

مزاج آپ کا دنیا سے کچھ کشیدہ سہی فریب کھاؤ گے پھر بھی، فریب دیدہ سہی
یہ سبز باغ کا عالم، یہ رنگ لیل و نہار بہل ہی جائے گا دل، آپ سے رمیدہ سہی
یہ غنچہ کیسا کہ دیکھے سے دل دھڑکتا ہے ارے یہ ایک ہی فتنہ ہے، نو دمیدہ سہی
نگاہ شوق کی گرمی خدا کی قدرت ہے مزے پہ آ ہی گیا حسن، نا رسیدہ سہی

کھٹکتی رہتی ہے دل میں نگاہ دز دیدہ   خطائے حسن کہے کون؟ چشم دیدہ سہی
نگاہ حسن سے اب تک وفا ٹپکتی ہے   ستم رسیدہ سہی، پیرہن دریدہ سہی
فریب ابر کرم بھی بڑا سہارا ہے   بلا سے نخل تمنا خزاں رسیدہ سہی
پتے کی کہیے تو ظالم کا رنگ اڑتا ہے   زبان حال سیاک حرف نا شنیدہ سہی
ہوا جو بگڑی تو ٹھنڈا ہی کر کے چھوڑے گی   ہزار شعلۂ بے باک سر کشیدہ سہی
نکل ہی جاتا ہے مطلب، تری قسم کھا کر   یگانہ ٹھن گئی بے ڈھب تو سوچتے کیا ہو

تو بندگان ضرورت کا آفریدہ سہی
شریک کار نہیں تو نہیں، جریدہ سہی

ٹھوکریں کھلوائیں کیا کیا پائے بے زنجیر نے   گردش تقدیر نے جولانیٔ تدبیر نے
عالم اسباب سے کیا فیض ناکامی ملا   راہ پر لا کر مجھے بھٹکا دیا تقدیر نے
کارواں کتنے بگولے بن کے غائب ہو گئے   خاک سے یکساں کیا جولاں گہ تدبیر نے
باز آئے زندگی کے خواب رنگا رنگ سے   دست و پا گم کر دئے اندیشۂ تعبیر نے
داد خواہی کو اٹھا ہے ذرۂ پامال تک   سوتے فتنوں کو جگایا حشر عالم گیر نے
ماتم حسرت کیا پہلے گریباں پھاڑ کر   پھر دعا دی دشمنوں کو دست بے شمشیر نے
جان دے کر ایک حکم آخری مانا تو کیا   لکھ دیا جب سرکشوں میں کاتب تقدیر نے
واہ کیا کہنا، مجسم کر دیا موہوم کو   نقش بندان ازل کی شوخیٔ تحریر نے

جم گئی گرد فنا ایسی کہ چھٹنے کی نہیں
کس غضب کا رنگ پکڑا یاس کی تصویر نے

دل آگاہ نے جب راہ پہ لانا چاہا   عقل گمراہ نے دیوانہ بنانا چاہا
ناگہاں چرخ ستم گار نے کروٹ بدلی   بخت بیدار نے جب مجھ کو جگانا چاہا
پھر سمانے لگی دنیا کی ہوا "میں" کی طرح   زانوے فکر سے جب سر کو اٹھانا چاہا
دل بیدار نے گھبرا کے مجھے چونکایا   نفس نے جب کسی مشکل میں پھنسانا چاہا
جذبۂ شوق نے جب عشق کی صورت پکڑی   پھر مٹائے نہ مٹا، لاکھ ستانا چاہا
جامہ زیبوں پہ کفن نے بھی دیا دہ جوبن   دوڑ کر سب نے کلیجے سے لگانا چاہا
بال و پر نوچ کے صیاد نے آزاد کیا   حق خدمت جب اسیروں نے جتانا چاہا

لکھنؤ میں غزل اب یاس کو پڑھنے ہی نہ دو
ذرّے نے پہلوئے خورشید دبانا چاہا

کارگاہ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے   اک طرف اجڑتی ہے، ایک سمت بستی ہے
بے دلوں کی ہستی کیا، جیتے ہیں، نہ مرتے ہیں   خواب ہے نہ بیداری، ہوش ہے نہ مستی ہے
کیا بتاؤں کیا ہوں میں قدرت خدا ہوں میں   میری خود پرستی بھی عین حق پرستی ہے
کیمیائے دل کیا ہے، خاک ہے، مگر کیسی؟   لیجئے تو مہنگی ہے، بیچئے تو سستی ہے
خضر منزل اپنا ہوں، اپنی راہ چلتا ہوں   میرے حال پہ دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے
کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا   فکر کی بلندی یا حوصلہ کی پستی ہے
حسن بے تماشا کی دھوم کیا معمہ ہے   کان بھی ہیں نامحرم، آنکھ بھی ترستی ہے
چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا   چال سے تو کافر پر سادگی برستی ہے
ترک لذت دنیا کیجئے تو کس دل سے   ذوق پارسائی کیا فیض تنگ دستی ہے

دیدنی ہے یاس اپنے رنج و غم کی طغیانی
جھوم جھوم کر کیا کیا یہ گھٹا برستی ہے

آئینے میں سامنا جب ناگہاں ہو جائے گا   پردۂ غیرت وہاں بھی درمیان ہو جائے گا
کس محبت سے جگہ دی دل نے درد عشق کو   کیا خبر تھی تختۂ خوں میہماں ہو جائے گا
نیند کے ماتے ٹھہر جا آنکھ کھلنے کی ہے دیر   چشم حیراں میں سبک خواب گراں ہو جائے گا
جان دیتے دیر کیا لگتی ہے تیری راہ میں   دل سلامت ہے تو یہ بھی امتحاں ہو جائے گا
رہزنوں کا پھر کوئی دھڑکا نہ کھٹکا خار کا   پہلی منزل سے جب آگے کارواں ہو جائے گا
چار دن کی زندگی ہے کاٹ دو ہنس بول کر   دل لگا لو پھر قفس ہی آشیاں ہو جائے گا
کیا سمجھتے تھے کہ دل سا شیشۂ نازک مزاج   چوٹ کھاتے کھاتے اتنا سخت جاں ہو جائیگا

دیکھ لو حسن یگانہ دور سے بیگانہ وار
پاس جاؤ گے تو پردہ درمیاں ہو جائے گا

کعبۂ مقصود خلوت خانۂ دل ہو گیا   جلوۂ موہوم آخر خضر منزل ہو گیا
عشق سے آئینۂ ادراک کے جوہر کھلے   خانۂ دل شاہد معنی کی منزل ہو گیا
وحشت آباد جہاں کی دل فریبی دیکھئے   سینکڑوں آزاد پابند سلاسل ہو گیا
خامۂ قدرت کی ہر صنعت ہے آپ اپنی مثال   امتیاز خوب و زشت آنکھوں کو مشکل ہو گیا
غش ہیں سب اہل نظر اس بولتی تصویر پر   خاک کے پتلے کو کیا اعجاز حاصل ہو گیا
جذبۂ صادق نے کھینچی خوب تصویر وطن   صحن دل گلدستۂ یاران یک دل ہو گیا
ناتوانی کا برا ہو غش پہ غش آنے لگے   وہ گھڑی دل کھول کر رونا بھی مشکل ہو گیا

تم سراسر رنج دینے پر جب آمادہ ہوئے　　میں سراپا درد سہنے کے لئے دل ہو گیا

اس طلسمات عناصر کی حقیقت کھل گئی　　جب گڑھے میں گور کے انسان داخل ہو گیا

یاس اب تنگ آگئے ہیں ملگجی پوشاک سے

جامہ تن دھجیاں لینے کے قابل ہو گیا

آنکھ دکھلانے لگا ہے وہ فسوں ساز مجھے　　کہیں اب خال نہ چھنوائے یہ انداز مجھے

کیسے حیراں تھے تم آئینے میں جب آنکھ لڑی　　آج تک یاد ہے اس عشق کا آغاز مجھے

سامنے آنہیں سکتے کہ حجاب آتا ہے　　پردۂ دل سے سناتے ہیں وہ آواز مجھے

تیلیاں توڑ کے نکلے سب اسیران قفس　　مگر اب تک نہ ملی رخصت پرواز مجھے

پر کتر دے ارے صیاد چھری پھیرنا کیا　　مار ڈالے گی یونہی حسرت پرواز مجھے

زیر دیوار صنم قبر میں سوتا ہوں فلک!　　کیوں نہ ہو طالع بیدار پر اب ناز مجھے

بے دھڑک آئے نہ زنداں میں نسیم وحشت　　مست کر دیتی ہے زنجیر کی آواز مجھے

پردۂ ہجر وہی ہستی موہوم تھی یاس

سچ ہے پہلے نہیں معلوم تھا یہ راز مجھے

بندہ وہ بندہ جو دم نہ مارے　　پیاسا کھڑا ہو دریا کنارے

دکھ درد تو ہی سمجھے نہ سمجھے　　گونگا تو گونگا کس کو پکارے

بندوں سے اپنے اتنا تغافل　　چوکھٹ پہ کوئی سر دے نہ مارے

اف رے مشیت پھولے تو لاکھوں　　پھلتے نہ دیکھے سارے کے سارے

فتنہ بھی پامال اپنا بھی یہ حال　　کروٹ بدلیے کس کے سہارے

اتنا بھی سیدھا سادہ چلن کیا　　ایسے کو کوئی کیوں کر ابھارے

ٹکرا کے دیکھیں تم کیا ہو ہم کیا　　جیتے تو جیتے، ہارے تو ہارے

لیلیٰ ہے لیلیٰ اندھا ہے اندھا　　مشاطہ چاہے جتنا سنوارے

حسن یگانہ، اللہ اللہ

یہ بھیس بدلے یہ روپ دھارے

رباعیات

ساجن کو سکھی منالو پھر سو لینا — سوئی قسمت جگا لو پھر سو لینا
سوتا سنسار ، سننے والا بیدار — اپنی بیتی سنا لو پھر سو لینا

دل کیا ہے اک آگ ہے دہکنے کے لئے — دنیا کی ہوا کھا کے بھڑکنے کے لئے
یا غنچۂ سر بستہ چٹکنے کے لئے — یا خار ہے پہلو میں کھٹکنے کے لئے

واللہ یہ زندگی بھی ہے قابل دید — اک طرفہ طلسم، دید جس کی نہ شنید
منزل کی دھن میں جھومتا جاتا ہوں — پیچھے تو اجل ہے آگے آگے امید

منزل کا پتا ہے نہ ٹھکانہ معلوم — جب تک نہ ہو گم ، راہ پہ آنا معلوم
کھولیتا ہے انسان تو کچھ پاتا ہے! — کھویا ہی نہیں تونے تو پانا معلوم

دکھتا ہوا دل ٹٹول لینے والا — آنکھوں آنکھوں میں تول لینے والا
دل کی آواز گوشِ دل سے سن کر — کیا ہے کوئی درد مول لینے والا؟

درد اپنا کچھ اور ہے، دوا ہے کچھ اور — ٹوٹے ہوئے دل کا آسرا ہے کچھ اور
ایسے ویسے تو خدا بہتیرے ہیں — میں بندہ ہوں جس کا وہ خدا ہے کچھ اور

صبحِ ازل و شامِ ابد کچھ بھی نہیں — اک وسعت موہوم ہے حد کچھ بھی نہیں
کیا جانیے کیا ہے عالمِ کون وفساد — دعوے تو بہت کچھ ہیں سند کچھ بھی نہیں

چارہ نہیں کوئی جلتے رہنے کے سوا — سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تری حیات فانی کیا ہے — جھونکا کھانے سنبھلتے رہنے کے سوا

پھر جوشِ غضب سے کام لیتے ہی بنی — پھر چشم کرم سے کام لیتے ہی بنی
منہ سے تو نہ پھوٹے آپ ماشا اللہ — آنکھوں سے مگر سلام لیتے ہی بنی

پیری کی ہوس ہزار منتر پڑھتی — گھٹنے کے سوا عمر رواں کیا بڑھتی
جھونکے میں فنا کے کیا پنپتا کوئی — مُرجھائی ہوئی بیل منڈھے کیا چڑھتی

روتا ہے بدا جنہیں وہ جم جم روئیں — جب عیش مہیا ہو تو ہم کیوں کھوئیں

فردا معلوم و رازِ فردا معلوم   رات اپنی ہے پھر کیوں نہ مزے سے سوئیں

مخمور مئے شباب ہو لینا تھا   کم سے کم ایک نیند سو لینا تھا
دامان ہوس کہیں بھگو لینا تھا   بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لینا تھا

ہاں اے دلِ ایذا طلب آرام نہ لے   بدنام نہ ہو مفت کا الزام نہ لے
ہاتھ آ نہ سکے پھول تو کانٹے ہی سہی   ناکام پلٹنے کا کبھی نام نہ لے

مطلب نہیں کوئی ترکِ منزل کے سوا   مقصد نہیں کوئی ترکِ باطل کے سوا
کعبہ کا ہوا میں ، نہ صنم خانے کا   سر جھک نہ سکا کہیں درِ دل کے سوا

دنیا کے مزے ہیں کس قیامت کے مزے   صحرا کی گھنی چھاؤں میں جنت کے مزے
کچھ دیر تو بیٹھے چلو سائے میں   کیا یاد کرو گے دشت غربت کے مزے

وہ جوش وہ اضطراب منزل میں کہاں   وہ شوق طلب تھکے ہوئے دل میں کہاں
شاعر کی تہ کو فلسفی کیا پہنچے   منجدھار کا زور شور ساحل میں کہاں ؟

مردوں کو یہ دنیائے دنی کیا پھلتی ؟   سر پھوڑ چلے، کوہ کنی کیا چلتی؟
معلوم ہے فرہاد پہ جو کچھ گزری   ٹل جائے قیامت ، شدنی کیا ٹلتی؟

اے لکھنؤ ، اے دیار دور افتادہ   اے جانِ من اے بہار دور افتادہ
اب دور سے اس خاک کو سجدہ کر لے   میں کون ہوں اک مزار دور افتادہ

کیا مفت کا بہتان خدا پر باندھا   کیا گردش تقدیر کا چرخہ باندھا
فطرت کیا ساتھ دیتی نا مردوں کا   جیتے مردے کو کون دیتا کاندھا

بے درد، دوا مانگنے والا تو کون؟   کیوں میرے سوا مانگنے والا تو کون؟
ہنستا ہوں خود اپنے حال پر، میرے لئے   رو رو کے دعا مانگنے والا تو کون؟

مشکل کوئی شکل نہیں جینے کے سوا   خاموش لہو کا گھونٹ پینے کے سوا
کھلتے ہیں جب ہی جوہر تسلیم و رضا   جب کوئی سپر ہی نہ ہو سینے کے سوا

ہوں صید کبھی اور کبھی صیاد ہوں میں   کچھ بھی نہیں بازیچۂ اضداد ہوں میں

مختار مگر اپنی حدوں میں محدود
ہاں وسعت زنجیر تک آزاد ہوں میں

کشتی آخر اجل سے لڑتے ہی بنی
لڑنے کو لڑے مگر پچھڑتے ہی بنی
کاغذ کی ناؤ میں جہاں آگ لگی
گھبرا کے بھنور میں کود پڑتے ہی بنی

دیکھوں کب تک گلوں کی یہ تشنہ لبی؟
فطرت کا گلہ کروں تو ہے بے ادبی
پیاسے تو ہیں جان بلب مگر ابر کرم
دریا پہ برستا ہے زہے بوالعجبی

گھر چھوڑ جو دربدر ہوا کچھ نہ ہوا
بیکار کا درد سر ہوا کچھ نہ ہوا
فانوس کے باہر نہ تھی شمع کی لو
جب دھیان اِدھر اُدھر ہوا کچھ نہ ہوا

امکان طلب سے کوئی آگاہ تو ہو
منزل کا پتہ دل سے ہوا خواہ تو ہو
چل پھر کے ذرا دیکھ جھجکتا کیا ہے
مل جائے گی راہ راست گمراہ تو ہو

مردوں کا اصول جان لینے کی ہے دیر
دشوار کو سہل مان لینے کی ہے دیر
منجدھار تو کیا ہے آگ میں کود پڑی
کچھ بھی نہیں دل میں ٹھان لینے کی ہے دیر

موجوں سے لپٹ کے پار اترنے والے
طوفان بلا سے نہیں ڈرنے والے
کچھ بس نہ چلا تو جان پر کھیل گئے
کیا چال چلے ہیں ڈوب مرنے والے

دل تنگ نہ ہو تنگ خیالوں کی طرح
جوتے بھی کھاؤ تو تر نوالوں کی طرح
کھسیانی ہنسی ہنس کے کرو دل خالی
صورت ہی بنا لو ہنسنے والوں کی طرح

ان عقل کے اندھوں میں ہے یہ غل کیسا
میں جز ہوں وہ کل ہے یہ تعقل کیسا
کل ہی کل ہے کہاں کا جز کیسا جز
جز کل سے الگ ہوا تو پھر کل کیسا

دکھ درد کو موہوم سمجھنا مشکل
مشکل ہے یہ مفہوم سمجھنا مشکل
اپنی ہستی غلط، نہ اپنی بیتی
موجود کو معدوم سمجھنا مشکل

دنیا میں رہ کے راست بازی کب تک
مشکل ہے کچھ آسان نہیں سیدھا مسلک
سچ بول کے کیا حسین بنا ہے تجھے
اتنا سچ بول، دال میں جیسے نمک

دل نشہ میں سرشار نظر آنے لگا
ویرانہ بھی گلزار نظر آنے لگا

کیا جانیں محبت نے چڑھایا کیا رنگ — عالم گل بے خار نظر آنے لگا

ہاں فکر رسا دیکھ بڑا بول نہ بول — گنجینۂ راز اندھی نگری میں نہ کھول
جس کی جتنی ضرورت ، اتنی قیمت — ہیرا کبھی کنکر ہے، کبھی انمول

یاران چمن یہ رنگ و بو مجھ سے ہے — تم سے کیا ہوگا لکھنؤ مجھ سے ہے
میں جان سخن ہوں، بلکہ ایمان سخن — دنیائے ادب کی آبرو مجھ سے ہے

گزری ہے بہار عمر تنکے چنتے — آتش کدۂ شوق میں جلتے بھنتے
یاران چمن گاتے ہیں اپنی اپنی — میری سنتے تو دیر تک سر دھنتے

کھوٹے تو بہت دیکھے کھرے کم دیکھے — دل دیکھے مگر درد بھرے کم دیکھے
سنجیدہ مزاج، اور ایسے مکار — ایسے مکار مسخرے کم دیکھے

منبر پہ جناب جب کبھی ریز کریں — جو بات کریں مضحکہ انگیز کریں
انگور حلال اور مے انگور حرام — گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز کریں

بہتیرے جوانان خوش اسلوب مرے — بے موت بھسم ہو گئے یا ڈوب مرے
مرنا اس کا کہ مر کے زندہ ہو جائے — مرنے کو مرے ہم بھی مگر خوب مرے

شاہوں سے مری کلاہ ٹیڑھی ہی رہی — بدمغزوں سے رسم و راہ ٹیڑھی ہی رہی
ٹیڑھے مرزا کو کون سیدھا کرتا — سیدھی نہ ہوئی نگاہ ٹیڑھی ہی رہی

کعبہ کی طرف دور سے سجدہ کرلوں — یا دیر کا آخری نظارہ کر لوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا — ایک اور گنہ کرلوں کہ توبہ کرلوں

ارمان نکلنے کا مزہ ہے کچھ اور — اور رشک سے جلنے کا مزہ ہے کچھ اور
ہاں یاد ہے دوست سے لپٹنا ، لیکن — دشمن کو کچلنے کا مزہ ہے کچھ اور

بخشش کسے کہتے ہیں عنایت کیسی — ملک اپنا ہے، مال اپنا، اجازت کیسی
قدرت کا خزانہ ہے تصرف کے لئے — تقدیر کے ٹکڑوں پہ قناعت کیسی

وہ مست کہ بے پئے چھلکتا جائے — نشہ میں شباب کے بہکتا جائے
آئینے کا سامنا کرے گا کیوں کر — اپنے سائے سے جو بھڑکتا جائے

مہماں ہے تو، صاحب خانہ ہوں میں
آئینہ حسن جاودانہ ہوں میں
مجھ سا کوئی دوسرا، نہ تجھ سا کوئی
یکتائے جہاں تو ہے، یگانہ ہوں میں

رہنے کا نہیں بند در آزادی
دیتی ہیں ہوائیں خبر آزادی
دروازہ زنداں در توبہ تو نہیں
ہاں المدد اے درد سر آزادی

اللہ غنی بتوں کی یہ جلوہ گری
کیا ساری خدائی ہے خداؤں سے بھری
اتنے ہیں خدا تو خود پرستی ہی بھلی
یکسوئی ہے اچھی کہ پریشاں نظری؟

زیبا نہیں یہ تنگ مزاجوں کے چلن
گلچیں سے لاگ، باغباں سے ان بن
کیا حوصلہ، کیا ظرف ہے ماشاء اللہ
اک ٹھیس میں دہری دہری ماتھے پہ شکن

دنیا سے الگ جاکے کہیں سر پھوڑو
یا جیتے جی مردوں سے ناتا جوڑو
کیوں ٹھوکریں کھانے کو پڑے ہو بیکار
بڑھنا ہے بڑھو، نہیں تو رستہ چھوڑو

بے درد ہو، کیا جانو مصیبت کے مزے
ہیں رنج کے دم قدم سے راحت کے مزے
دوزخ کی ہوا تو پہلے کھا لو صاحب
کیا ڈھونڈتے ہو ابھی جنت کے مزے

منزل کی جستجو میں گم رہتا ہوں
ہنگامۂ آرزو میں گم رہتا ہوں
امید کا سبز باغ، اے صلی علیٰ
اک عالم رنگ و بو میں گم رہتا ہوں

اندھی نگری کے رہنے بسنے والے
نظارۂ معنی کو ترسنے والے
ٹوٹے ہوئے دل کے نغمۂ دل کش پر
دیوانی ہنسی ہنستے ہیں ہنسنے والے

دیوانۂ عشق کو نصیحت توبہ!
وہ عقل کی باتیں وہ حماقت توبہ!
جذبہ کسی جذبے ہی سے مٹ سکتا ہے
نفرت سے بدل گئی محبت توبہ!

اتنا سادہ تو کوئی انسان بنے
محفل میں قدم رکھتے ہی نادان بنے
گہرے اتنے کہ تھاہ دیتے ہی نہیں
بیٹھے ہیں جو کھوئے ہوئے انجان بنے

کہنے کو تو کعبہ بھی خدا کا گھر ہے
دیکھا تو وہی اینٹ ہے یا پتھر ہے
حق کا مرکز ہے حق شناسوں کے لئے
یہ سینۂ بے کینہ عجب مندر ہے

آخر نگہ شوق نے گرما ہی دیا
مجبور نے مختار کو شرما ہی دیا
کچھ بس نہ چلا اپنے گنہ گاروں سے
سرکار نے حکم عشق فرما ہی دیا

ہر روز نیا رکھتی ہے جوبن دنیا
مکار و زمانہ ساز و پر فن دنیا
معلوم نہیں کھا گئی کتنوں کو
کہتے ہیں جسے سدا سہاگن دنیا

کیوں خانۂ تاریک میں ہے گوشہ نشیں
ہے گلشن عالم بھی طلسم رنگیں
ہاں چونک ذرا سیر تو کر او غافل
آنکھیں جو ہوئیں بند تو پھر کچھ بھی نہیں

راتیں یونہی کٹ جاتی ہیں روتے روتے
دن جاتے ہیں منہ اشکوں سے دھوتے دھوتے
دامن کو چھڑا کر وہ گیا ہے جب سے
ہاتھوں کے اسی دن سے اڑے ہیں توتے

کیا فصل بہار کی خبر نے مارا
یا بوالہوسی کے درد سر نے مارا
یاران شکستہ پر ہیں کتنے بے تاب
کس کی آواز بال و پر نے مارا؟

جب اٹھ گیا پردہ تو نظر کیوں نہ اٹھے
لڑ جائے نظر تو شور و شر کیوں نہ اٹھے
انسان ہے انسان فرشتہ تو نہیں
شیطان چڑھا سر پہ تو سر کیوں نہ اٹھے

آسان نہیں موت کی آہٹ لینا
گہوارۂ بے خودی میں کروٹ لینا
بیدار دلی ہے اور الٹی زحمت
اچھا نہیں اپنے سر پہ جھنجھٹ لینا

دنیا سے اٹھے ہیں دل کی دل ہی میں لئے
کس کام کی زندگی کہ ناکام جئے
وہ درد دیا جس کی دوا تھی نہ دعا
دل تجھ سے لگایا تھا اسی دن کے لئے

کیوں کھول دئے راز ازل کے ناحق
پنجے میں پھنسے آپ اجل کے ناحق
ہاں، کیوں نہ اٹھے شور انا الحق پہ فساد
بڑ مار اٹھے پیٹ کے ہلکے ناحق

آئینہ حق ہوں ،خود پسندی کیسی
دیوانہ ہوں اپنا،ہوش مندی کیسی
عالم میں جدھر دیکھئے میں ہی میں ہوں
پستی کسے کہتے ہیں بلندی کیسی؟

دل نشہ میں سرشار نظر آنے لگا
ویرانہ بھی گلزار نظر آنے لگا
کیا جانے محبت نے چڑھایا کیا رنگ
عالم گل بے خار نظر آنے لگا

منظور نہیں کسی کی خاطر نہ سہی
ہوتے نہیں خود بزم میں ظاہر نہ سہی
آئینہ در آئینہ تمہیں دیکھ لیا
غائب ہی سہی، بلا سے حاضر نہ سہی

دل کو حد سے سوا دھڑکنے نہ دیا
قالب میں روح کو پھڑکنے نہ دیا
کیا آگ تھی سینے میں جسے فطرت نے
روشن تو کیا مگر بھڑکنے نہ دیا

دل زندہ ہے، درد مغتنم کب تک
آباد ہے گھر، ہجوم غم ہے جب تک
بچھڑے ہیں تو کیا، آپ سے اک لاگ تو ہے
دم بھرتے رہیں گے دم میں ہے دم جب تک۔

آپ اپنی بلاؤں میں کیوں گھرتا ہے
خشکی میں ڈوب کر کوئی ترتا ہے
کیا باؤ کے گھوڑے پہ اڑا پھرتا ہے
جھونکا کھاتے ہی منہ کے بل گرتا ہے

گرداب بلا میں سب ہیں گھرنے والے
آخر کو ہیں دن سب کے، پھرنے والے
کیا کہئے مگر سنگ دلوں کا انجام
پتھر کہیں ڈوبتا ہے ترنے کے لئے

دھارا ہے زمانے کا بے سروپا
پھرتے ہیں زمیں و آسمان بے سروپا
کیا جانئے کس منزل موہوم کی دھن
کھینچے لئے جاتی ہے کہاں بے سروپا

یگانہ اردو کے بے مثال شاعر تھے۔ امداد امام اثر نے ان کی شاعری میں مردانہ بانکپن پر بہت زور دیا ہے اور خلیل الرحمٰن اعظمی نے اسی مردانہ لہجے کو ان کی شاعری کا امتیازی وصف بتایا ہے۔ یگانہ اردو کے بہت عمدہ شاعر تھے اور فارسی میں بھی خوب کہتے تھے۔ ان کو اردو میں غالب شکن کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کے اس قلندرانہ آہنگ کو مستحکم کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا جس نے ہمیشہ کٹھ ملائیت اور مذہبی تنگ نظری کی مخالفت کی۔ ان کے ہاں جس رویے کو غالب شکنی کا نام دیا گیا اس کی تہذیب بھی مسلمہ نظریات وعقائد کو بھی جانچنے، پرکھنے اور پھر قبول یا رد کرنے کا جذبہ ہی کارفرما تھا۔ انھوں نے ہر قسم کی تنگ نظری کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ وہ فن شاعری کی باریکیوں سے خوب آگاہ تھے اور عروض پر بھی اچھی نظر رکھتے تھے۔ ان کی تاریخ ولادت عام طور پر 17 اکتوبر 1884 تسلیم کی گئی ہے۔ وہ 1905 میں لکھنؤ منتقل ہو گئے اور 1920 تک پہنچتے پہنچتے یگانہ اور لکھنؤ کے شاعروں کے درمیان ادبی معرکے انتہائی سنگین صورت اختیار کر گئے۔ عظیم آباد کے ایک مشاعرے میں انھوں نے ایک غزل پڑھی جس میں یہ اشعار بھی تھے:

جان سے بڑھ کر سمجھتے ہیں مجھے یاس اہل دل
آبروئے لکھنؤ، خاک عظیم آباد ہوں
لکھنؤ کے فیض سے ہیں دو دوسہرے میرے سر
اک تو استاد یگانہ دوسرے داماد ہوں

معاصرین اور غالب پر یگانہ کے اعتراضات کی لے حد سے بڑھ ہی چکی تھی، مذہب پر ان کے اعتراضات کی لے بھی حد سے بڑھ گئی۔ ان سب کے نتیجے میں 31 مارچ 1953 کو اہل لکھنؤ نے یگانہ کے مکان پر حملہ کیا اور اس شاعر بے بدل کا جلوس رسوائی نکالا۔ جو ہماری ادبی تاریخ کا سیاہ ترین نقطہ ہے۔ یگانہ کی شاعری اور ان کی شخصیت پر اردو میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔

یگانہ پر یہ مونوگراف ڈاکٹر حسن مثنیٰ نے تیار کیا ہے جو رانچی کالج سے وابستہ ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

₹ 90.00